منٹو
نیا ادارہ • لاہور

ہماری مطبوعات

تین غنڈے — کرشن چندر — ۲/۸

طلسم خیال — ,, — ۲/-

ٹوٹے ہوئے تارے — ,, — ۱/۱۲

زندگی کے موڑ پر — ,, — ۲/-

ٹیڑھی لکیر — عصمت چغتائی — ۶/۸

ایک بات — ,, — ۳/-

آگ کے آغوش میں — انور — ۲/۸

نقش فریادی — فیض — ۲/-

تلخیاں — ساحر — ۲/۸

طلوع و غروب — ندیم — ۲/-

جلال و جمال — ,, — ۷/-

ہائے اللہ — ہاجرہ مسرور — ۲/۸

قوم اور قومیت — طفیل احمد — ۱/۸

منتخب نظمیں ۱۹۴۶ء — ادارہ سویرا — ۱/۴

بہترین نظمیں ۱۹۴۷ء — حلقۂ ارباب ذوق — ۱/۸

باسی پھول — علی عباس حسینی — ۲/۸

میلہ گھومنی — ,, — ۳/-

ماوراء — ن۔م۔ راشد — ۲/۸

شعلۂ ساز — فراق — ۵/-

بادۂ مشرق — ساغر — ۴/۸

آیات و نغمات — جوش — ۵/-

سیف و سبو — ,, — ۵/-

جنون و حکمت — ,, — ۴/-

لذت سنگ — منٹو — ۲/-

یونہی تو نہیں جینا — شفیق برلاس — ۳/۸

سعادت حسن منٹو

لذتِ سنگ

نیا ادارہ • لاہور

طبع اوّل

قیمت دو روپے

پبلشرز:- نذیر چودھری آف نیا ادارہ۔ لاہور

پرنٹرز:- کوآپریٹو کیپیٹل پرنٹنگ پریس لاہور

ترتیب

محمد حسین چودھری کے نام

(مردِ ناداں پر کلامِ نرم و نازک بے اثر)

سر کھجاتا ہوں جہاں زخمِ سر اچھا ہو جائے
لذتِ سنگ باندازۂ تقریر نہیں

(غالب)

لاہور کے ایک رسوائے عالم رسالے میں جو فحاشی و بیہودگی کی اشاعت کو اپنا پیدائشی حق سمجھتا ہے، ایک افسانہ شائع ہوا ہے۔ جس کا عنوان ہے "بو" اور اس کے مصنّف ہیں مسٹر سعادت حسن منٹو۔ اس افسانے میں نوجی عیسائی لڑکیوں کا کیریکٹر اس درجہ گندہ بتایا گیا ہے کہ کوئی شریف آدمی برداشت نہیں کر سکتا۔ افسانہ نگار نے اظہارِ مطلب کے لئے جو اسلوب اختیار کیا ہے اور جو الفاظ منتخب کئے ہیں۔ ان کے لئے تہذیب و شرافت کے دامن میں کوئی جگہ نہیں ہو سکتی، لیکن حکومت اب تک خاموش ہے، حالانکہ یہی حکومت ہے جو "لذت النساء" اور "کوک شاستر" ایسی فنّی؟ (یہ استفہامیہ میرا ہے) کتابوں کو بھی قابلِ مواخذہ سمجھتی ہے۔ لیکن ایسے افسانوں کی طرف متوجہ نہیں ہوتی جو ادبِ جدید کے نام سے سفلی جذبات میں ہلچل ڈالنے کا موجب ہیں اور فحاشت نگار ادیبوں کو کھلی چھٹی دے رکھی ہے وہ قانون کی گرفت سے بے نیاز ہو کر گندگی بکھیرتے رہتے ہیں۔ (ہفتہ وار خیام لاہور)

پریس برانچ کے انچارج چودھری محمد حسین بہت نیک خیال کے بزرگ

ہیں۔ اس قسم کے افسانے پڑھ کر ان کی رُوح یقیناً کانپ اٹھتی ہے۔ ان کے ہاتھ میں قانون ہے اور وہ اسے نہایت سختی سے استعمال کر سکتے ہیں۔ کیا اُن کے لئے یہ ممکن نہیں تھا کہ جس طرح قابلِ اعتراض مذہبی مضامین لکھنے والوں کے خلاف گورنمنٹ کی مشینری حرکت میں آئی۔ اسی طرح ان گندے افسانوں کو لکھنے والے سعادت حسن منٹو وغیرہ، بیچنے والے پبلشر جو رسالے کی فروخت سے ہزاروں روپیہ کماتے ہیں اور چھاپنے والے پریس کے مالک کو فوراً گرفتار کر لیتے اور ان میں سے ایک ایک کو تین تین سال کے لئے جیلوں میں بند کرا دیتے۔ ہمیں یقین ہے کہ کوئی بھی عدالت ان افسانوں کو قانون کی رُو سے نہیں بچنے دے گی۔ یہ صاف طور سے نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں میں بداخلاقی پھیلاتے ہیں اور عوام کا مذاق بگاڑتے ہیں

(روزنامہ پربھات لاہور)

ادبِ لطیف، اس نام کا ایک رسالہ لاہور سے شائع ہوتا ہے۔ یہ کہنے کو تو ایک ادبی ماہنامہ ہے۔ لیکن اگر اسے ادبِ کثیف کہیئے تو بجا ہے۔ اس کا سالانہ نمبر اس وقت ہمارے پیشِ نظر ہے۔ جس میں ایک لچر اور فحش افسانہ از قلم فحش نگار سعادت حسن منٹو شائع ہوا ہے جس کے خلاف ہم نہایت پُرزور احتجاج کرتے ہیں نہ فقط اس کے کوک شاستر انہ خیالات کی وجہ سے بلکہ اس لئے بھی کہ یہ گورنمنٹ عالیہ کی ویمنز اگزیلیری کور (WAC) کی مساعی در بابِ جنگ کی راہ میں روڑا

اُکسانے والا اور اس کی بدنامی کا موجب ہے۔ حتیٰ کہ اس مجلہ کو یہ بیہودہ شخص قحبہ خانہ کا نام دیتا ہے۔ ہم حیران ہیں کہ اور چھوٹی چھوٹی باتوں پر تو گورنمنٹ کی مشینری فوراً حرکت میں آجاتی ہے۔ لیکن اس خلافِ تہذیب مضمون پر اس کی اب تک نظر نہیں پڑی۔ کیا سپرنٹنڈنٹ پریس برانچ اس بد اخلاق اور بے ادب ادیب اور رسالہ مذکور کے خلاف جلد کوئی کارروائی نہ کریں گے؟ دیکھا چاہیئے! (انحوت لاہور)

ایک مقامی ماہنامہ نے سعادت حسن منٹو کا ایک فحش افسانہ "بُو" شائع کیا تھا خیام میں اس اخلاق سوز حرکت کے خلاف آواز اُٹھائی گئی تھی جو حکومت پنجاب کے کانوں تک پہنچے بغیر نہ رہ سکی۔ چنانچہ معلوم ہوا ہے کہ جس پرچے میں "بُو" شائع ہوا تھا۔ وہ ضبط کر لیا گیا ہے۔ یہ ضبطی ۲۹۲/۳۸ دفعہ کے ماتحت عمل میں آئی۔ ہم اس فیصلے پر حکومت پنجاب کو مستحق تبریک سمجھتے ہیں اور امید کرتے ہیں کہ وہ اس قسم کی فحاشی کو مستقل طور پر روکنے کے لئے کوئی مؤثر قدم اُٹھائے گی۔

(ہفتہ وار خیام۔ ۸ اپریل سنہ ۱۹۴۴ء)

اے ملک بلڈنگ، میو روڈ لاہور

بھائی جان سلام شوق

برادرم آغا خلش صاحب کا گرامی نامہ پرسوں ملا تھا۔ آپ کی علالت کا علم ہوا۔ الله کرے

آپ اب تک اچھے ہوں۔ جب آپ کو اپنی صحت کا اندازہ ہے تو اتنا زیادہ کام کیوں
کرتے ہیں کہ دنوں صاحبِ فراش رہتے ہیں مجھے لوٹتی ڈاک میں اپنی صحت کی حالت
سے مطلع کیجئے اور للہ اتنی محنت نہ کیجئے کہ آپ انجکشن کے کانٹوں میں گھرے رہ
جائیں۔ ابھی برسوں تک آپ کی ضرورت ہے۔

یعنی جام، عالمگیر، آئینہ (بمبئی) اور دیگر مہربانوں کے دم سے "ادب لطیف" کا
سالنامہ زیر دفعہ ۲۹۲ تعزیراتِ ہند اور ۳۸ ڈیفنس آف انڈیا رولز ۲۹ مارچ کی
شام کو ضبط ہو گیا۔ پولیس نے چھاپہ مارا اور سالنامے کے باقی ماندہ نمبر لے گئی۔ ابھی
پروپرائٹر اور ایڈیٹروں کی گرفتاری عمل میں نہیں آئی۔ لیکن افواہ ہے کہ ہم بہت جلد
گرفتار کر لئے جائیں گے۔ یہ ضبطی آپ کے مضمون اور افسانے کی وجہ سے عمل میں آئی ہے۔

(احمد ندیم قاسمی ایڈیٹر ادب لطیف)

مضمون جس کا ذکر محولہ صدر خط میں ہے۔ ایک تقریر ہے جو میں نے جوگیشوری کالج بمبئی
میں طالب علموں کو پڑھ کے سنائی تھی۔ اس سے پہلے چند اصحاب ادب جدید کے خلاف
اس کالج میں تقریریں کر چکے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ میں نے کالج کی مجلسِ ادب کی دعوت قبول
کی اور اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ یہ تقریر بعد میں "ادب جدید" کے عنوان سے "ادب لطیف" کے
زیرِ عتاب سالنامہ ۱۹۴۴ء میں میرے افسانے "بو" کے ساتھ شائع ہوئی۔ میں اسے
ذیل میں نقل کرتا ہوں:-

میرے مضمون کا عنوان ادبِ جدید ہے۔ لطف کی بات یہ ہے کہ میں اس کا مطلب ہی نہیں سمجھتا۔ لیکن یہ زمانہ ہی کچھ ایسا ہے کہ لوگ اُسی چیز کے متعلق باتیں کرتے ہیں جن کا مطلب اُن کی سمجھ میں نہیں آتا ۔۔۔ پچھلے دنوں گاندھی جی نے آغا خان کے محل میں مرن برت رکھا۔ جب لوگوں کی سمجھ میں نہ آیا۔ وہ کس طرح زندہ رہ سکے ہیں تو ایک نارنگی پیدا کر دی گئی۔ یہ نارنگی بھی کچھ دنوں کے بعد ناقابلِ فہم ہو گئی۔ بعض آدمیوں نے کہا کہ نارنگی نہیں تھی موسمبی تھی۔ بعض نے کہا۔ نہیں، موسمبی نارنگی ہرگز نہیں تھی، مالٹا تھا ۔۔۔ بات بڑھتی گئی۔ چنانچہ اس پھل کی ساری ذاتیں گنوا دی گئیں ۔۔۔ نارنگی، سنگترہ، موسمبی، مالٹا، چکوترہ، سویٹ لائم، کھٹا لیموں، میٹھا لیموں وغیرہ وغیرہ ۔۔۔ پھر ڈاکٹروں نے ان میں سے ہر ایک کی وٹامنز گنوائیں۔ غذائیت کو کیلوریز میں تقسیم کیا گیا ۔۔۔ ایک برس میں پچھتر برس کے بڈھے کو کتنی کیلوریز کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس پر بحث کی گئی اور صاحب گاندھی جی کی یہ نارنگی یا موسمبی جو کچھ بھی تھی سعادت حسن منٹو بن گئی ۔۔۔ یہ میرا نام ہے۔ لیکن بعض لوگ ادبِ جدید المعروف نئے ادب یعنی ترقی پسند ادب کو سعادت حسن منٹو بھی کہتے ہیں اور جنہیں صنفِ کرخت پسند نہیں۔ وہ اسے عصمت چغتائی بھی کہہ لیتے ہیں۔

جس طرح میں یعنی سعادت حسن منٹو اپنے آپ کو نہیں سمجھتا۔ اسی طرح ادبِ جدید المعروف نیا ادب یعنی ترقی پسند لٹریچر بھی میری فہم سے بالاتر ہے اور جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں۔ اُن لوگوں کی سمجھ سے بھی اونچا ہے جو اس کو سمجھنے

کی کوشش کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر چند مضمونوں میں اس ادب کو جس کے کئی نام ہیں اور زیادہ نام دینے کے لئے فحش نگاری اور مزدور پرستی سے منسوب کیا گیا ہے۔

میں چیزوں کے نام رکھنے کو بُرا نہیں سمجھتا۔ میرا اپنا نام اگر نہ ہوتا تو وہ گالیاں کسے دی جاتیں جو اب تک میں ہزاروں اور لاکھوں کی تعداد میں اپنے نقادوں سے وصول کر چکا ہوں ـــ نام ہو تو گالیاں اور شاباشیاں دینے اور لینے میں بہت سہولت پیدا ہو جاتی ہے۔ لیکن اگر ایک ہی چیز کے بہت سے نام ہوں تو اُلجھاؤ پیدا ہونا ضروری ہے سب سے بڑا الجھاؤ اس ترقی پسند ادب کے بارے میں پیدا ہوا ہے۔ حالانکہ پیدا نہیں ہونا چاہئے تھا ـــ ادب یا تو ادب ہے۔ ورنہ ادب نہیں ہے۔ آدمی یا تو آدمی ہے ورنہ آدمی نہیں ہے۔ گدھا ہے، مکان ہے، میز ہے، یا اور کوئی چیز ہے ـــ کہا جاتا ہے کہ سعادت حسن منٹو ترقی پسند انسان ہے ـــ یہ کیا بیہودگی ہے۔ سعادت حسن منٹو انسان ہے اور ہر انسان کو ترقی پسند ہونا چاہئے۔ ترقی پسند کہہ کر لوگ میری صفت بیان نہیں کرتے بلکہ اپنی بُرائی کا ثبوت دیتے ہیں۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ وہ خود ترقی پسند نہیں ہیں یعنی وہ ترقی نہیں چاہتے ـــ میں زندگی کے ہر شعبے میں ترقی کا خواہشمند رہا ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ سب ترقی کریں ـــ آج آپ طالب علم ہیں۔ ترقی کرتے کرتے آپ بھی اپنے آئیڈیل تک پہنچ جائیں۔

ہر آدمی ترقی پسند ہے۔ وہ لوگ جنہیں تخریبی یا رجعت پسند کہا جاتا ہے۔ خود کو ترقی پسند ہی سمجھتے ہیں ـــ اور پھر ہر زمانے میں قریب قریب ہر آدمی گذری ہوئی نسل کے

مقابلے میں اپنے کو زیادہ ذہین، طبّاع اور ترقی یافتہ انسان ہی سمجھتا ہے۔ یہی حال ادب کا ہے۔ شرر کے ناول اور راشد الخیری کے قصّے آج کل کے اکثر مصنفین کو بالکل بے جان معلوم ہوتے ہیں۔ پڑھنے والوں کی بھی یہی کیفیت ہے۔ مارکیٹ میں چلے جائیے ۔۔ آج سے دس بیس برس پہلے کے لکھنے والوں کی کتابیں اسٹالوں پر بہت کم دکھائی دیتی ہیں۔ کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، عصمت چغتائی اور سعادت حسن منٹو کی کتابیں ایم اسلم، تیرتھ رام فیروزپوری، سیّد امتیاز علی تاج اور عابد علی عابد کے مقابلے میں زیادہ پڑھی جاتی ہیں۔ اس لئے کہ کرشن چندر اور اُس کے ہم عصر نوجوانوں نے زندگی کے نئے تجربے بیان کئے۔

آج سے بیس پچیس برس پہلے ملک کی سیاسی اور مجلسی حالت بالکل مختلف تھی ۔۔۔ اسی طرح آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ پچاس ساٹھ برس اور پہلے کیسی ہوگی اگر مغلیہ حکومت کا دور دورہ ہوتا تو بہت ممکن ہے۔ میرے گھر میں ایک حرم سرائے ہوتی۔ حرم سرائے نہ ہوتی تو کم از کم ایک بیوی گھر میں ہوتی اور دو تین طوائفیں میری ملازمت میں ہوتیں۔ مجھے بٹیریں لڑانے کا شوق ہوتا۔ یہ مضمون پڑھنے کے بجائے میں پرنسپل صاحب بالقابہ کی شان میں ایک قصیدہ سُناتا جو خوش ہو کر یا تو میرا منہ موتیوں سے بھر دیتے یا جو گیشوری کالج مجھے بخش دیتے تاکہ میں اسے اپنا طویلہ بنا سکوں مگر جیسا کہ آپ جانتے ہیں۔ حالت بہت مختلف ہے۔ مجھے یہاں سے پیدل اسٹیشن جانا پڑے گا اور غلمستان میں اپنے آقاؤں کو جواب دینا پڑے گا کہ میں اتنی دیر

ڈاکٹر کے پاس کیا کرتا ہا ۔ میں ان سے جھوٹ بول کے آیا ہوں کہ ڈاکٹر سے ٹیکہ لگوانے جا رہا ہوں
ہاں تو میں عرض کر رہا تھا کہ حالات بہت مختلف ہیں اور یہ اختلاف ہی ادب میں مختلف رنگ پیدا کرتا ہے۔ پہلے فارغ البالی تھی۔ لوگ آرام پسند اور عیش پرست تھے۔ اس زمانے کے ادب میں آپ کو بہت سی دماغی عیاشیاں نظر آسکتی ہیں۔ وہ غنودگی بھی آپ محسوس کر سکتے ہیں جو اس زمانے کے ادیبوں پر طاری تھی۔ اس زمانے میں شاعر اپنے آمیل مُرغ کی جوانامرگی پر زوردار نوحہ لکھتا تھا اور بہت بڑا شاعر تسلیم کیا جاتا تھا۔ آج کا شاعر اپنی جوانامرگی کے نوحے لکھتا ہے۔ اُس عہد کا قصہ نویس جنوں اور پریوں کی داستانیں لکھ کر نام پیدا کرتا تھا۔ آج کا افسانہ نویس ان مردوں اور عورتوں کی کہانیاں لکھتا ہے جو جنوں اور پریوں سے کہیں زیادہ عجیب ہیں۔ اُس دور کا ادیب مطمئن انسان تھا۔ آج کا ادیب ایک غیر مطمئن انسان ہے اپنے ماحول، اپنے نظام، اپنی معاشرت، اپنے ادب حتیٰ کہ اپنے آپ سے بھی۔ اُس کی اِس بے اطمینانی کو لوگوں نے غلط نام دے رکھے ہیں۔ کوئی اسے ترقی پسندی کہتا ہے۔ کوئی فحش نگاری اور کوئی مزدور پرستی! یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ان ادیبوں کے اعصاب پر عورت سوار ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ ہبوطِ آدم سے لے کر اب تک ہر مرد کے اعصاب پر عورت سوار رہی ہے اور کیوں نہ رہے۔ مرد کے اعصاب پر کیا ہاتھی گھوڑوں کو سوار ہونا چاہئے۔ جب کبوتر کبوتریوں کو دیکھ کر گٹکتے ہیں تو مرد عورتوں کو دیکھ کر ایک غزل یا افسانہ کیوں نہ لکھیں۔ عورتیں

کبوتریوں سے کہیں زیادہ دلچسپ، خوبصورت اور فکر خیز ہیں۔ کیا میں جھوٹ کہتا ہوں
آج سے کچھ عرصہ پہلے شاعری میں عورت کو ایک خوبصورت لڑکا بنا دیا گیا تھا۔
ظاہر ہے کہ اُس زمانے کے شاعروں نے اس میں کوئی مصلحت دیکھی ہوگی۔ مگر آج
کے شاعر اس مصلحت کے خلاف ہیں۔ وہ عورت کے چہرے پر سبزے یا خط کے آغاز
کو بہت ہی مکروہ اور خلافِ فطرت سمجھتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ دوسرے بھی اُس کو
اُس کی اصلی شکل ہی میں دیکھیں۔۔ خدا لگتی کہئے کیا آپ اپنی محبوبہ کے گالوں پہ
داڑھی پسند کریں گے؟

میں عرض کر رہا تھا کہ زمانے کی کروٹوں کے ساتھ ادب بھی کروٹیں بدلتا
رہتا ہے۔۔ آج اس نے جو کروٹ بدلی ہے۔ اس کے خلاف اخباروں میں
مضمون لکھنا یا جلسوں میں زہر اگلنا بالکل بیکار ہے۔ وہ لوگ جو ادبِ جدید کا
ترقی پسند ادب کا فحش ادب کا یا جو کچھ بھی یہ ہے، خاتمہ کر دینا چاہتے ہیں تو صحیح
راستہ یہ ہے کہ اُن حالات کا خاتمہ کر دیا جائے جو اس ادب کے محرک ہیں۔

محمود آباد کے راجہ صاحب کا، حیدرآباد کے شاعر ماہر القادری صاحب کا
یا بمبئی کے دوا فروش حکیم مرزا حیدر بیگ صاحب کا اس لٹریچر کے خلاف
ریزولیوشن پاس کرنا بالکل بیکار ہے۔ جب تک عورتوں اور مردوں کے جذبات کے
درمیان ایک موٹی دیوار حائل رہے گی عصمت چغتائی اس کے چونے کو اپنے
تیز ناخنوں سے کریدتی رہے گی۔ جب تک کشمیر کے حسین دیہاتوں میں شہروں کی

گندگی پھیلی رہے گی، غریب کرشن چندر ہولے ہولے روتا رہے گا۔ جب تک انسانوں میں اور خاص طور پر سعادت حسن منٹو میں کمزوریاں موجود ہیں وہ خوردبین سے دیکھ دیکھ کر باہر نکالتا اور دوسروں کو دکھاتا رہے گا۔۔ راجہ صاحب محمود آباد اور اُن کے ہم خیال کہتے ہیں۔ یہ سراسر بیہودگی ہے ۔۔ تم جو کچھ لکھتے ہو خرافات ہے ۔۔ میں کہتا ہوں بالکل دُرست ہے، اس لئے کہ میں بیہودگیوں اور خرافات ہی کے متعلق لکھتا ہوں۔ راجہ صاحب محمود آباد ایک کانفرنس کے صدر بن جائیں یا حکیم حیدر بیگ صاحب کھانسی دُور کرنے کا مجرّب شربت ایجاد کر دیں ۔۔ مجھے اُن کی صدارت اور اُن کے شربت سے کوئی دلچسپی نہیں ۔۔ البتہ جب میں ٹرین میں بیٹھا بیٹھا اپنا نیا خریدا ہوا قیمتی پن نکالتا ہوں، صرف اس غرض سے کہ لوگ دیکھیں اور مرعوب ہوں تو مجھے اپنا سفلہ پن بہت دلچسپ معلوم ہوتا ہے ۔۔ میرے پڑوس میں اگر کوئی عورت ہر روز خاوند سے مار کھاتی ہے اور پھر اُس کے جُوتے صاف کرتی ہے تو میرے دل میں اُس کے لئے ذرّہ برابر ہمدردی پیدا نہیں ہوتی لیکن جب میرے پڑوس میں کوئی عورت اپنے خاوند سے لڑ کر اور خودکشی کی دھمکی دے کر سینما دیکھنے چلی جاتی ہے اور میں خاوند کو دو گھنٹے سخت پریشانی کی حالت میں دیکھتا ہوں تو مجھے دونوں سے ایک عجیب و غریب قسم کی ہمدردی پیدا ہو جاتی ہے ۔۔

کسی لڑکے کو لڑکی سے عشق ہو جائے تو میں اسے زکام کے برابر اہمیت نہیں دیتا مگر وہ لڑکا میری توجہ کو اپنی طرف ضرور کھینچے گا جو ظاہر کرے کہ اس پر

سینکڑوں لڑکیاں جان دیتی ہیں۔ لیکن درحقیقت وہ محبت کا اتنا ہی بھوکا ہے جتنا بنگال کا فاقہ زدہ باشندہ۔۔ اس بظاہر کامیاب عاشق کی رنگین باتوں میں جو ہچکیاں چھپی ہوئی ہوں گی، اُس کو میں اپنے دل کے کانوں سے سُنوں گا اور دوسروں کو سناؤں گا۔۔ چکی پیسنے والی عورت جو دن بھر کام کرتی ہے اور رات کو اطمینان سے سو جاتی ہے۔ میرے افسانوں کی ہیروئن نہیں ہو سکتی۔ میری ہیروئن چکلے کی ایک ٹکھیائی رنڈی ہو سکتی ہے جو رات کو جاگتی ہے اور دن کو سوتے میں کبھی کبھی یہ ڈراؤنا خواب دیکھ کر اُٹھ بیٹھتی ہے کہ بڑھاپا اس کے دروازے پر دستک دینے آرہا ہے۔۔ اُس کے بھاری بھاری پپوٹے جن میں برسوں کی اچٹی ہوئی نیندیں منجمد ہو گئی ہیں، میرے افسانوں کا موضوع بن سکتے ہیں۔ اُس کی غلاظت، اُس کی بیماریاں اس کا چڑچڑاپن، اُس کی گالیاں، یہ سب مجھے بھاتی ہیں۔۔۔ میں ان کے متعلق لکھتا ہوں اور گھریلو عورتوں کی شستہ کلامیوں، اُن کی صحت اور اُن کی نفاست پسندی کو نظر انداز کر جاتا ہوں۔

اعتراض کیا جاتا ہے کہ نئے لکھنے والوں نے عورت اور مرد کے جنسی تعلقات ہی کو اپنا موضوع بنا لیا ہے۔ میں سب کی طرف سے جواب نہیں دوں گا۔۔ اپنے متعلق اتنا کہوں گا کہ یہ موضوع مجھے پسند ہے۔۔ کیوں ہے؟۔۔ بس ہے۔۔ سمجھ لیجئے کہ مجھ میں Perversion ہے۔ اور اگر آپ عقلمند ہیں۔ چیزوں کے عواقب و عواطف اچھی طرح جانچ سکتے ہیں تو سمجھ لیں گے کہ یہ بیماری مجھے کیوں لگی ہے۔۔۔ زمانے

کے جس دور سے ہم اس وقت گذر رہے ہیں۔ اگر آپ اس سے ناواقف ہیں۔ تو میرے افسانے پڑھئے، اگر آپ ان افسانوں کو برداشت نہیں کر سکتے۔ تو اس کا مطلب ہے کہ یہ زمانہ ناقابلِ برداشت ہے ۔۔۔ مجھ میں جو برائیاں ہیں وہ اس عہد کی برائیاں ہیں ۔۔۔ میری تحریر میں کوئی نقص نہیں جس نقص کو میرے نام سے منسوب کیا جاتا ہے۔ دراصل موجودہ نظام کا نقص ہے ۔۔۔ میں ہنگامہ پسند نہیں۔ میں لوگوں کے خیالات وجذبات میں ہیجان پیدا کرنا نہیں چاہتا ۔۔۔ میں تہذیب و تمدن اور سوسائٹی کی چولی کیا اتاروں گا جو ہے ہی ننگی ۔۔۔ میں اسے کپڑے پہنانے کی کوشش بھی نہیں کرتا۔ اس لئے کہ یہ میرا کام نہیں درزیوں کا ہے ۔۔۔ لوگ مجھے سیاہ قلم کہتے ہیں۔ لیکن میں تختۂ سیاہ پر کالی چاک سے نہیں لکھتا، سفید چاک استعمال کرتا ہوں کہ تختہ سیاہ کی سیاہی اور بھی زیادہ نمایاں ہو جائے ۔۔۔ یہ میرا خاص انداز، میرا خاص طرز ہے جسے فحش نگاری، ترقی پسندی اور خدا معلوم کیا کچھ کہا جاتا ہے ۔۔۔ لعنت ہو سعادت حسن منٹو پر۔ کم بخت کو گالی بھی سلیقے سے نہیں دی جاتی ۔۔۔

جب میں نے لکھنا شروع کیا تھا تو گھر والے سب بیزار تھے۔ باہر کے لوگوں کو بھی میرے ساتھ دلچسپی پیدا ہو گئی تھی۔ چنانچہ وہ کہا کرتے تھے "کبھی کوئی نوکری کی تلاش کرو۔ کب تک بیکار پڑے افسانے لکھتے رہو گے" ۔۔۔ آٹھ دس برس پہلے افسانہ نگاری بیکاری کا دوسرا نام تھا۔ آج اسے ادب جدید کہا جاتا ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ لوگوں کے ذہن نے کافی ترقی کر لی ہے ۔۔۔ وہ وقت بھی آجائے گا جب اس

جدید ادب کا صحیح مطلب واضح ہو جائے گا۔ حکیم حمید بیگ صاحب دہلوی کو اپنے شفاخانے سے اٹھ کر نئے لکھنے والوں کے روگ کی تشخیص نہیں کرنا پڑے گی۔

جب سے جنگ شروع ہوئی ہے۔ ادب جدید پر ایک نئے زاویے سے حملہ کیا جا رہا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ جب ساری دنیا جنگ کے شعلوں میں لپٹی ہے۔ ہر روز ہزاروں انسانوں کا خون بھٹی میں جل رہا ہے۔ فنا، بادۂ ہر جام بنی ہے۔ دوسری اجناس کی طرح انسانوں کے گوشت پوست کی دکانیں بھی کھلی ہیں۔ یہ نئے لکھنے والے کیوں خاموش ہیں ——؟ —— کیا ان کے قلم صرف جنسیات کی روشنائی ہی میں ڈوبتے ہیں؟ —— دنیا کا نقشہ بدل رہا ہے۔ ہر لحظہ، ہر گھڑی ایک نئے طوفان کا پیغام لا رہی ہے مگر ان کے دل و دماغ پر ایسا جمود طاری ہے کہ ٹس سے مس نہیں ہوتا۔

میں پھر دوسروں کی طرف سے جواب نہیں دوں گا —— اپنے متعلق عرض کرنا چاہتا ہوں کہ دنیا کا نقشہ واقعی بدل رہا ہے۔ لیکن اگر میں نے اس کے متعلق کچھ لکھ دیا —— تو میرا بھی حلیہ بدل جائے گا —— ڈرپوک آدمی ہوں، جیل سے بہت ڈر لگتا ہے۔ یہ زندگی جو بسر کر رہا ہوں جیل سے کم تکلیف دہ نہیں۔ اگر اس جیل کے اندر ایک اور جیل پیدا ہو جائے اور مجھے اس میں ٹھونس دیا جائے تو چٹکیوں میں میرا دم گھٹ جائے —— زندگی سے مجھے پیار ہے۔ حرکت کا دلدادہ ہوں۔ چلتے پھرتے سینے میں گولی کھا سکتا ہوں۔ لیکن جیل میں کھٹمل کی موت نہیں مرنا چاہتا —— یہاں اس پلیٹ فارم پر یہ مضمون سناتے سناتے آپ سب سے مار کھا لوں گا اور اُف تک

نہیں کروں گا۔ لیکن ہندو مسلم فساد میں اگر کوئی میرا سر پھوڑ دے تو میرے خون کی ہر بوند روتی رہے گی۔ میں آرٹسٹ ہوں، اوچھے زخم اور بھدے گھاؤ مجھے پسند نہیں ۔۔۔ جنگ کے بارے میں کچھ لکھوں اور دل میں پستول دیکھنے اور اس کو چھونے کی حسرت دبائے کسی تنگ و تاریک کوٹھڑی میں مر جاؤں ۔۔۔ ایسی موت سے تو یہی بہتر ہے کہ لکھنا وکھنا چھوڑ کر ڈیری فارم کھول لوں اور پانی ملا دودھ بیچنا شروع کر دوں۔ میں اس جنگ کے بارے میں کچھ نہیں لکھوں گا ۔۔۔ گولے اور تارپیڈو ایک طرف رہے۔ میں نے تو آج تک ہوائی بندوق بھی نہیں چلائی ۔۔۔ بچپن کی بات ہے۔ ہمارے پڑوس میں ایک تھانیدار رہتے تھے۔ ان کے پاس ایک پستول تھا۔ پیٹی اتار کر جب وہ پلنگ پر رکھتے تو سب بچوں سے کہہ دیا جاتا "دیکھو اس کمرے میں مت جانا ۔۔۔ وہاں پستول پڑا ہے" ۔۔۔ کبھی کبھی ہم ڈرتے ڈرتے اس کمرے میں چلے جاتے۔ دور کھڑے رہ کر اس خطرناک آگ کی طرف دیکھتے تو دل دھک دھک کرنے لگتا۔ ایسا محسوس ہوتا کہ پڑے پڑے وہ پستول داغ جائے گا ۔۔۔ اب بتلائیے میں اور میرے دوست ٹینکوں کے بارے میں کیا لکھیں گے ۔۔۔ مجھے جینٹ وردی پہننے کا شوق نہیں ہے۔ پیتل اور تانبے کے تمغوں اور کپڑے کے رنگین بلّوں سے مجھے کوئی دلچسپی نہیں۔ ہوٹلوں میں ڈانس کر کے، کلبوں میں شراب پی کر اور ٹیکسیوں میں چند کتھائی لڑکیوں کے ساتھ گھوم کر میں وار ایفرٹ کی مدد کرنا نہیں چاہتا ہے اس سے کہیں زیادہ دلچسپ مشاغل مجھے میسر ہیں ۔۔۔ مثال کے طور پر یہ شغلہ

کیا بُرا ہے کہ میں ہر روز بمبے سنٹرل سے گریٹ گاؤں اور گریٹ گاؤں سے بمبے سنٹرل تک برقی ٹرین میں سینکڑوں وردی پوش نوجیوں کو دیکھتا ہوں جو فتح و نصرت کو اور زیادہ قریب لانے کے لئے شراب کے نشے میں مدہوش یا ٹانگیں پسارے سو رہے ہوتے ہیں، یا نہایت ہی بدنما عورتوں سے میری موجودگی سے غافل نہایت ہی واہیات قسم کا رومانس لڑانے میں مصروف ہوتے ہیں۔

میں اس جنگ کے بارے میں کچھ نہیں لکھوں گا۔ لیکن جب میرے ہاتھ میں پستول ہو گا اور دل میں یہ دھڑکا نہیں رہے گا کہ یہ خود بخود چل پڑے گا تو میں اسے لہراتا ہوا باہر نکل جاؤں گا اور اپنے اصلی دشمن کو پہچان کر یا تو ساری گولیاں اس کے سینے میں خالی کر دوں گا — یا خود چھلنی ہو جاؤں گا — اس موت پر جب میرا کوئی نقاد یہ کہے گا کہ پاگل تھا تو میری رُوح ان لفظوں ہی کو سب سے بڑا تمغہ سمجھ کر اٹھا لے گی اور اپنے سینے پر آویزاں کر لے گی۔

اس تقریر یا مضمون پر حکومت پنجاب نے زیر دفعہ ۳۸ ڈیفنس آف انڈیا رُولز مقدمہ چلایا الزام یہ تھا کہ اس میں حضور ملک معظم کی "فورسز" کے متعلق ایسی غلط باتیں موجود ہیں جن سے اُن کو ضعف پہونچ سکتا ہے۔ "بُو" جو اس کتاب کا پہلا افسانہ ہے، صرف فحاشی کا الزام تھا۔

مقدمہ جیسا کہ ظاہر ہے۔ لاہور میں چوہدری برکت علی ولد محمد بخش ساکن لاہور (مالک

ادبِ لطیف) چوہدری نذیر احمد ولد غلام حسین قوم اراعین ساکن لاہور (اڈیٹر) پیرزادہ احمد ندیم قاسمی ساکن لاہور (اڈیٹر) سعادت حسن منٹو ولد غلام حسن ساکن بمبئی کے خلاف مسٹر بنواری لال کی عدالت میں پیش ہوا۔ مجھے بمبئی سے بہت ضروری کام چھوڑ کر حاضر ہونا پڑا۔ لاہور پہنچا تو خیال تھا کہ مجھے گرفتار کیا جائے گا۔ کیونکہ میرے وارنٹ جاری ہو چکے تھے مگر سب انسپکٹر صاحب نے جن سے اتفاقیہ مکتبہ اردو میں ملاقات ہو گئی۔ مجھ سے کہا کہ میں صبح دوسرے ملزمین کے ساتھ عدالت میں حاضر ہو جاؤں۔

گورنمنٹ کالج کے بالکل سامنے گرد و غبار میں اٹی ہوئی اینٹوں کی دو منزلہ عمارت ہے جسے ضلع کہتے ہیں شاید کچہری کے طور پر۔۔۔ اس عمارت کے ایک کمرے میں ہم سب ملزم پیش ہوئے۔ پہلے میری ضمانت ہوئی۔ اس کے بعد کارروائی شروع ہوئی۔ میں اس سے پہلے اسی عدالت میں اپنے افسانے "کالی شلوار" کے مقدمے کے سلسلے میں پیش ہو چکا تھا۔ مجسٹریٹ صاحب چنانچہ میری طرف دیکھتے ہی مسکرا دیئے۔ استغاثے کی گواہیاں ہوتی رہیں۔ میں خاموش سنتا رہا۔ اس لیے کہ سب کی سب لایعنی، بے ہودہ اور منطق و دانش سے عاری تھیں۔ اسی روز میں نے اپنے وکیل مسٹر ہیرالال سبل کی معرفت عدالت سے درخواست کی کہ میری حاضری آئندہ پیشیوں میں معاف کر دی جائے۔ عدالت نے یہ درخواست منظور کر لی۔

اتفاق سے ان دنوں میرے بڑے بھائی الحاج محمد حسن منٹو بار ایٹ لا جزائر فجی سے لاہور آئے ہوئے تھے۔ میں نے ان کو اپنا افسانہ "بُو" اور مضمون "ادبِ جدید" پڑھنے کے لئے

دیا اور پوچھا کہ انجام کیا ہوگا۔ دونوں چیزیں بغور پڑھنے کے بعد انہوں نے جواب دیا "میرا خیال ہے کہ استغاثے کی گواہیاں سننے کے بعد ہی مجسٹریٹ مقدمہ خارج کر دے گا" — لیکن ایسا نہ ہوا۔ میں بمبئی سے چلا آیا تھا۔ وہاں لاہور میں فردِ جرم عائد ہو گیا اور دو نو چوہدریوں اور احمد ندیم قاسمی کو صفائی کے گواہ پیش کرنے میں کافی دوڑ دھوپ کرنی پڑی۔ اسی دوران میں مسٹر بنواری لال تبدیل ہو گئے اور اُن کی جگہ چوہدری مہدی علی خان متعین ہوئے۔ چونکہ یہ مقدمے کی تفصیل سے بخوبی واقف نہیں تھے۔ اس لئے فیصلہ مرتب کرنے میں کافی دیر ہو گئی۔

۲ مئی ۱۹۴۵ء کو چوہدری مہدی علی خاں نے بالآخر فیصلہ سنا دیا۔ صرف اتنا کہا، سعادت حسن منٹو بری ہے۔ اس لئے کہ مسٹر بنواری لال اسے پہلے ہی بری کر چکے تھے۔ میں نے سوچا۔ اگر ایسا ہی تھا تو مجھے بمبئی سے لاہور آنے کی زحمت کیوں دی گئی — احمد ندیم قاسمی بھی بری کر دیئے گئے۔ لیکن دونوں چوہدریوں کو ساٹھ روپے فی کس کے حساب سے جرمانہ ہوا۔ عدم ادائیگی کی صورت میں ایک ایک ماہ قید با مشقت — مشقت کا نام سنتے ہی چوہدریوں نے جیب میں ہاتھ ڈالا اور جرمانہ ادا کر دیا۔

اس کے بعد چوہدری مہدی علی خان کے فیصلے کے خلاف مسٹر ایم۔ آر۔ بھاٹیہ ایڈیشنل جج کی عدالت میں اپیل کی گئی — فیصلہ ۲۴ نومبر ۱۹۴۵ء کو ہوا جس کا ترجمہ یہ ہے:

> زیرِ نظر مقدمہ دفعہ ۲۹۲ تعزیراتِ ہند کے تحت ہے۔ جس میں برکت علی اور نذیر احمد کو ساٹھ روپے جرمانہ اور عدم ادائیگی کی صورت میں ایک ماہ قید

بامشقت کی سزا دی گئی ہے ۔۔۔ اس سزا کے خلاف مجھ سے اپیل کی گئی ہے۔

ماتحت عدالتِ فاضلہ نے اپنے فیصلے میں یہ ریمارک کیا ہے کہ مضمون "بُو" کا مصنف سوسائٹی کی نظروں میں سخت ترین سزا کا مستحق تھا اور یہ کہ وہی صحیح آدمی تھا جسے قانونی گرفت میں لینا چاہیے تھا مگر پیش رو فاضل جج (مسٹر بنواری لال) نے اُسے بری کر دیا۔

موجودہ ملزموں میں سے ایک پبلشر ہے اور دوسرا اڈیٹر جس نے مضمون چھاپا قابلِ غور امر ہے کہ ایسے اشخاص ملزمین کی صفائی میں پیش ہوئے جو اردو زبان کے عالم ہونے کی حیثیت میں بہت مشہور ہیں۔ مثال کے طور پر خان بہادر عبدالرحمٰن چغتائی، مسٹر کے۔ ایل کپور، پروفیسر ڈی۔ اے وی کالج، راجندر سنگھ (بیدی) اور ڈاکٹر آئی۔ ایل لطیف پروفیسر ایف سی۔ کالج جو بطور گواہانِ صفائی پیش ہوئے۔ ان سب کی رائے ہے کہ مضمون (بُو) میں ایسی کوئی چیز نہیں جو شہوانی حسیات پیدا کرے۔ بلکہ ان لوگوں کا یہ کہنا ہے کہ مضمون ترقی پسند ہے اور اردو ادب کے موڈرن رجحان سے تعلق رکھتا ہے۔ حتیٰ کہ استغاثہ کے گواہ نمبر چار۔ بشیر نے بھی دورانِ جرح میں تسلیم کیا کہ مضمون انسان کے اخلاق پر بُرا اثر نہیں ڈالتا۔

میری نظر میں مضمون ایک عشقیہ کہانی ہے۔ ایک لڑکے اور لڑکی کی؛ جس میں ایسی بات کا دلچسپ ذکر ہے جو عموماً ہر روز نوجوان آدمیوں میں نہیں ہوتی

ماتحت عدالتِ فاضلہ نے ہندوستانی نوجوانوں کی تعیش پسند زندگی کا ذکر کرتے ہوئے افسوس کیا ہے اور اس بات پر ماتم کیا ہے کہ ملک میں ہندوستانیوں کا پرانا کیرکٹر نابود ہو رہا ہے (ماتحت عدالت کے فاضل جج) نے وہ خوبیاں بھی یاد کرائی ہیں، جن کے لئے ہم ہندوستانی کبھی مشہور تھے اور یہ نصیحت کی ہے کہ نئے فیشنوں کو ختم کر دینا چاہئے۔

معلوم ہوتا ہے کہ ماتحت عدالتِ فاضلہ کے خیالات ترقی پسند نہیں ہیں — ہمیں زمانے کے ساتھ ساتھ چلنا ہے — حسین چیز ایک دائمی مسرت ہے۔ آرٹ، جہاں کہیں بھی ملے۔ ہمیں اس کی قدر کرنی چاہئے — آرٹ خواہ وہ تصویر کی صورت میں ہو یا مجسّے کی شکل میں، سوسائٹی کے لئے قطعی طور پر ایک پیش کش ہے۔ چاہے اس کا موضوع غیر مستور ہی کیوں نہ ہو۔ یہی کلیہ تحریروں پر بھی منطبق ہوتا ہے۔

جب ملک کے مشہور و معروف آرٹسٹوں اور ادیبوں نے ملزمین کے حق میں کہا ہے۔ سارا فیصلہ یہیں ہو جاتا ہے۔ زیر بحث مضمون ایسا مضمون نہیں کہ جس پر کسی قانونی عدالت میں نکتہ چینی کی جائے۔ اس لئے مجھے اپیل منظور کرنے میں کوئی پس و پیش نہیں۔ جرمانہ اگر ادا کیا گیا ہے تو واپس کیا جائے۔ میں اپیل کرنے والوں کو بری کرتا ہوں۔

مجھے چونکہ "شہادت" کا رتبہ حاصل نہیں کرنا ہے۔ اس لئے میں ان تکلیفوں کا ذکر

نہیں کرنا چاہتا۔ جو مجھے لاہور آنے جانے میں اٹھانی پڑیں۔ ایک لعنت سر سے دور ہو گئی۔ یہی کافی تھا مجھے ان اخباروں کے متعلق بھی کچھ نہیں کہنا ہے۔ جن میں ہفتوں بلکہ مہینوں حکومت اور رعایا کو اخلاقیات کے سبق دیئے جاتے رہے۔ افسوس صرف اتنا ہے کہ یہ پرچے ایسے لوگوں کی ملکیت ہیں، جو عضوِ خاص کی لاغری اور کجی دُور کرنے کے اشتہار خدا اور رسول کی قسمیں کھا کھا کر شائع کرتے ہیں۔ لیکن اپنے اڈیٹروں کی ٹیڑھی ننگی ٹانگوں اور ان کی جھکی ہوئی کمروں کا مطلق خیال نہیں کرتے ــــ مجھے ان قلم سے مزدوری کرنے والوں سے دلی ہمدردی ہے۔ ان میں سے اکثر شریف آدمی ہیں۔ جنہیں ادب سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔ لیکن چونکہ پرچہ چھپنا ہی چاہیئے اور اس میں شروع سے لے کر آخر تک کچھ لکھا بھی ہونا چاہیئے۔ اس لئے یہ مجبور انسان، سیاست، سائنس اور ادب پر جو بھی ان کے نا تربیت یافتہ دماغوں میں آئے۔ کاغذ پر گھسیٹ دیتے ہیں۔ مجھے افسوس ہے کہ صحافت جیسے معزز پیشے پر ایسے لوگوں کا اجارہ ہے۔ جن میں سے اکثر طلا فروش ہیں۔

پنجاب کی پریس برانچ کے متعلق میں "ایں دفترِ بے معنی" نہیں کہہ سکتا۔ اس لئے کہ یہ دفتر اپنے معنی وقتاً فوقتاً ضرورت کے مطابق نکالتا رہتا ہے۔ چند برسوں سے اس کے معنی یہ ہیں کہ علامہ اقبال مرحوم کے بعد خدائے عزوجل نے ادب کے تمام دروازوں میں تالے ڈال کر ساری چابیاں ایک نیک بندے کے حوالے کر دی ہیں ــــ کاش علامہ مرحوم زندہ ہوتے !!

پولس کی عدالتیں تو خیر پولس کی عدالتیں ہیں ــــ اندھی روح اور گنجے فرشتے !

اس اندھی رُوح، گنجے فرشتوں، اور پنجاب کے طلا فروش اخبار والوں اور رسالوں کے مالکوں اور اُن کے مریض اڈیٹروں کی بدولت ایک بار پھر مجھے لاہور کی اُس عدالت میں حاضر ہونا پڑا جسے جگت کے طور پر ضلع کہتے ہیں۔

اب کی مقدمہ ساقی بک ڈپو دہلی کی شائع کردہ کتاب "دھواں" پر تھا۔ الزام وہی فحاشی کا تھا۔ دو افسانے زیرِ عتاب تھے۔ کتاب کا پہلا افسانہ "دھواں" اور "کالی شلوار"۔ "کالی شلوار" پر دفعہ ہوا۔ قانونی پوسٹ مارٹم ہو چکا تھا اور سیشن کورٹ میں یہ فحاشی سے مبرا قرار دی جا چکی تھی۔ معلوم نہیں ایک بار پھر اس بے ضرر افسانے پر تعزیرات ہند کی دفعہ ۲۹۲ کیوں آزمائی گئی؟

اس دفعہ معاملہ کچھ زیادہ سنگین معلوم ہوا۔ کیونکہ میرے اور مسٹر شاہد احمد دہلوی (مالک ساقی بک ڈپو) کے علاوہ وہ کاتب بھی گرفتار کر لیا گیا۔ جس نے "دھواں" لکھنے کے گھناؤنے جرم کا ارتکاب کیا تھا۔ وہ کتب فروش بھی گرفتار کیے گئے۔ جن کے پاس یہ ملعون کتاب موجود تھی۔ پریس جس میں یہ چھپی تھی۔ اُس کا مالک بھی دھر لیا گیا۔

میں سلیقے کا بہت قائل ہوں۔ ناگوار سے ناگوار چیز بھی اگر سلیقے کے ساتھ کی جائے تو مجھے ناگوار معلوم نہیں ہوتی۔ لاہور سی آئی ڈی کے ایک سب انسپکٹر نے جس کا نام شاید رام کپور تھا مجھے ۵ دسمبر ۱۹۴۲ء کو گرے گاؤں سے "ملاڈ" پولس اسٹیشن بلوایا اور بغیر وارنٹ دکھائے گرفتار کر لیا۔ میں نے وارنٹ کے متعلق استفسار کیا تو رام بھروسے نے کہا۔ "پرائیویٹ کاغذات میں تمہیں نہیں دکھا سکتا۔" یہ حرکت مجھے بہت بری معلوم ہوئی۔ چنانچہ میں نے شام کو گھر آ کر اپنے سولسٹر کو ٹیلیفون کیا۔ جس نے مجھے بتایا کہ میری گرفتاری غیر قانونی ہے۔

اس لئے حسب حکم لاہور کی عدالت میں حاضر ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔ میں نے ایسا ہی کیا۔ لیکن ۸ جنوری ۱۹۴۵ء کو مجھے میرے مکان پر رات کے دس بجے قانونی طور پر گرفتار کرلیا گیا۔ عصمت چغتائی (مسز شاہد لطیف) کے ساتھ بھی قریب قریب یہی سلوک ہوا۔

۴ رفروری ۱۹۴۵ء کے "قومی جنگ" (بمبے) میں "بے ادب اور تہذیب پر حملہ" کے عنوان سے ایک مضمون علی سردار جعفری کے قلم سے شائع ہوا۔ جس کی ابتدائی سطور یہ ہیں:۔

اُردو کے بہترین افسانہ نگاروں میں سعادت حسن منٹو اور عصمت چغتائی کے نام بہت مشہور ہیں۔ حال ہی میں منٹو کے افسانوں کا ایک نیا مجموعہ "دھواں" اور عصمت کے افسانوں کا ایک نیا مجموعہ "چوٹیں" دہلی سے شائع ہوا ہے ان مجموعوں میں ان دونوں افسانہ نگاروں کی بعض بہت اچھی کہانیاں شامل ہیں۔ لیکن معلوم ہوا ہے کہ حکومت پنجاب نے عصمت اور منٹو کے بعض افسانوں کو عریاں قرار دے دیا ہے۔ ابھی تک یہ معلوم نہیں ہو سکا ہے کہ عتاب کون سے افسانوں پر نازل ہوا ہے۔ لیکن دونوں کتابیں زد میں ہیں مقدمے کی سماعت ابھی تک شروع نہیں ہوئی ہے۔ اسپیشل مجسٹریٹ کی عدالت میں ۲ رفروری کو عصمت اور منٹو کی پیشی ہونے والی ہے۔

لیکن عدالتی کارروائی سے پہلے ہی ان دونوں پر بہت کچھ گذر گئی۔ دسمبر ۴۴ء کو بمبئی کی پولس نے عصمت چغتائی کو بغیر وارنٹ کے گرفتار کر لیا او

ایک ہزار روپے کی ضمانت پر رہا کر دیا۔ ۶ دسمبر کو عصمت کو دادر پولس کورٹ میں حاضری دینی پڑی اور انہیں حکم ملا کہ ۶ جنوری ۱۹۴۵ء کو دوبارہ حاضر ہوں جنوری میں پنجاب سے عصمت کا وارنٹ آگیا اور انہیں دوبارہ گرفتار کر لیا گیا۔ اس مرتبہ دو ہزار روپے کی ضمانت دے کر گلو خلاصی ہوئی اور حکم ملا کہ عصمت ۲ فروری کو لاہور کے اسپیشل مجسٹریٹ کی عدالت میں جا کر حاضری دیں۔

تقریباً یہی حشر سعادت حسن منٹو کا ہوا۔

سعادت حسن منٹو کا حشر کچھ زیادہ ہی قابل رحم تھا۔۔۔ مجھے ان دنوں اعصابی درد کی شکایت تھی۔ گھر میں رات کے دس بجے جب مجھے گرفتار کیا گیا تو میں مارے درد کے کراہ رہا تھا۔ سینے پر گرم بوتل تھی۔ لیکن حکمِ حاکم مرگِ مفاجات لاہور حاضر عدالت ہونا ہی پڑا۔ اس دفعہ مقدمہ رائے صاحب لالہ سنت رام اسپیشل مجسٹریٹ کی عدالت میں پیش ہوا ۔۔۔ ایک لطیفہ سن لیجیے، عدالت میں داخل ہونے سے پہلے ایک ادھیڑ عمر کے شریف سے صاحب آئے اور مجھ سے ہاتھ ملا کر کہا" آپ سے مل کر بڑی خوشی ہوئی"۔

میں نے پوچھا" آپ کا اسم گرامی"

ادھیڑ عمر کے شریف سے صاحب نے جواب دیا" نانک چند ناز"

میں نے اپنا ہاتھ کھینچ لیا اور کہا" معاف کیجیے، مجھے آپ سے مل کر خوشی نہیں ہوئی"

لالہ نانک چند ناز استغاثہ کے معزز ترین گواہ تھے جو میرے اور عصمت چغتائی دونوں کے خلاف بھگتے ۔۔۔ آپ واقعی بھگتے ۔۔۔ ایک اور لطیفہ سن لیجیے۔ لالہ جی نے عصمت

کے افسانے "لحاف" کے متعلق کہا کہ اس میں گندے الفاظ استعمال کئے گئے ہیں۔

ہمارے وکیل مسٹر ہیرالال نے پوچھا "مثلاً"

لالہ جی نے "چوٹیں" اٹھائی۔ کافی دیر "لحاف" کی ورق گردانی کے بعد ایک لفظ نکالا "مثلاً۔ عاشق!"

ہم سب مسکرا دیے۔ مسٹر ہیرالال نے لالہ جی سے کہا "یہ لفظ گندہ ہے تو آپ اس کی جگہ کوئی دوسرا تجویز کر دیجئے"

لالہ جی سوچنے لگے۔

مسٹر ہیرالال نے پوچھا "یار کیسا رہے گا؟"

اس دفعہ رائے صاحب لالہ سنت رام بھی مسکرا دیئے۔

جب تک استغاثے کے گواہ پیش ہوتے رہے۔ ایسی مسکراہٹیں جاری رہیں۔ لیکن عدالت برخواست ہونے سے پہلے جب ہمارے وکیل نے درخواست پیش کی کہ مجھے اور عصمت کو آئندہ پیشیوں میں حاضر ہونے سے معاف کر دیا جائے اور جب مجسٹریٹ صاحب نے اسے مسترد کر دیا تو ہم دونوں کو یہ تکلیف دہ احساس ہوا کہ ہم عدالت میں پیش تھے اور ہم پر فحاشی کا سنگین جرم عائد تھا ـــ مجھے اس کا بھی شدید احساس ہوا۔ کہ سخت سردی ہے اور میں اعصابی درد میں مبتلا ہوں۔

عدالت سے باہر مسٹر ہیرالال سے مشورہ کیا گیا۔ ایک ہی صورت تھی کہ ہائی کورٹ میں اپیل کی جائے جو فوراً ہی داخل کر دی گئی۔ دوسرے روز میں اور عصمت آنریبل جسٹس

اچھرو رام کی عدالت میں پیش ہوئے۔ آپ نے ہم دونوں کو غور سے دیکھا اور کہا۔ "مجھے آپ دونوں کے افسانے بہت پسند ہیں"۔۔۔ ہمیں بہت خوشی ہوئی۔ لیکن انہوں نے اپیل کے کاغذات آنریبل جسٹس دین محمد کی عدالت میں منتقل کر دیئے۔

اب پھر دوسرے روز حاضر ہونا تھا۔ شام کو میری طبیعت بہت زیادہ خراب ہوگئی اتفاق سے میرا بھانجا میجر عبدالوحید ان دنوں لاہور کے ملٹری ہسپتال میں متعین تھا۔ اس نے میرا ایکس رے لیا اور بتایا کہ مجھے "ہائی ڈرو نیومو تھوریکس" ہے۔ یعنی میرے دہنے پھیپھڑے کے ایک حصے میں پانی اور ہوا داخل ہوگئی ہے۔

میجر وحید کے کہنے پر میں نے دوسرے روز صبح سویرے کرنل امیر چند سے بھی تشخیص کرائی۔ انہوں نے وہی مرض بتایا اور رائے دی کہ مجھے آرام کرنا چاہیئے۔ میں نے اُن سے سرٹیفکیٹ لے لیا کہ شاید کام آجائے ع داشتہ آید بکار۔

دوسرے روز آنریبل جسٹس دین محمد کی عدالت میں پیش ہوا۔ عصمت غیر حاضر تھی۔ جسٹس دین محمد صاحب نے قہر آلود نگاہوں سے میری طرف دیکھا اور بڑبڑائے "ان لوگوں کا وجود شایانِ ادب ہے"۔۔۔ مجھے ایسا لگا جیسے میری قسمت پر مہر لگا دی گئی ہے۔ انہوں نے اپیل منظور کرنے سے انکار کر دیا۔ لیکن جب میں نے اپنے وکیل سے کرنل امیر چند کا سرٹیفکیٹ پیش کرنے کے لئے کہا تو اپیل ایک قہر آلود دستخط نے منظور کر دی۔۔۔

میں بمبئی واپس چلا آیا۔

بمبئی میں بہت دیر تک ڈاکٹروں میں یہ بحث ہوتی رہی کہ میرا مرض کیا ہے۔ میجر وحید اور کرنل امیر چند کی تشخیص یہ کہتی تھی کہ مجھے "ہائی ڈرو نیو تھوریکس" ہے۔ لیکن ڈاکٹر لیملا اور ڈاکٹر الیف ڈبلیو برجر (یا برگر) کی ایکس رے دیکھنے کے بعد یہ رائے تھی کہ صرف "نیوموتھوریکس" ہے۔ آخر یہ فیصلہ ہوا کہ ڈاکٹر ایچ پی مودی سے جو ریڈیو آلوجی کے ماہر ہیں۔ رجوع کیا جائے۔ چنانچہ انہوں نے میرا پرانا ایکس رے دیکھنے اور نیا امتحان لینے کے بعد ڈاکٹر الیف ڈبلیو برجر (یا برگر) کو خط لکھا:۔

مریض اس وقت نورمل حالت میں ہے۔ "نیوموتھوریکس" اور "سیال مادہ" بالکل غائب ہے۔ یہ کیس جیسا کہ ظاہر ہے "سپانٹینس نیوموتھوریکس" کی قبیل سے تھا۔ ایسے چند کیس بعض اوقات "کوخ" میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔

اس "کوخ" کا مطلب مجھے لاہور میں میجر وحید نے بتایا۔ جب میں اس مقدمے کا فیصلہ سننے کے لئے گیا۔ مطلب یہ تھا کہ ایسے چند کیس بعض اوقات دق میں تبدیل ہو جاتے ہیں ـــ لیکن دق اور زچ میں اس وقت ہوا۔ جب میں نے صفائی کے گواہوں کی فہرست تیار کی اور رائے صاحب لالہ سنت رام نے اُن کی گواہی بذریعہ کمیشن لینے سے انکار کر دیا۔ کوئی گواہ حیدر آباد میں تھا، کوئی لکھنؤ میں اور کوئی بمبئی میں۔ لیکن رائے صاحب مصر تھے کہ سب کے سب لاہور میں حاضر ہوں ـــ مکرمی نیاز فتح پوری صاحب کو جب لکھنؤ میں اس کی اطلاع ملی تو انہوں نے لکھا:۔

یقیناً کمیشن کے ذریعے سے شہادت قلم بند ہو سکتی تھی اور اس میں بڑی

آسانی تھی۔ تعجب ہے کہ مجسٹریٹ نے اسے منظور نہیں کیا اور آپ کے مشیرِ قانون نے کیوں اس پر زور نہ دیا۔

مجھے معلوم نہیں۔ مسٹر جیرا لال نے اس پر زور دیا تھا یا نہیں۔ بہرحال رائے صاحب لالہ سنت رام کا فیصلہ اٹل تھا جس کا نتیجہ یہ ہوا۔ کہ قاضی عبد الغفار صاحب اڈیٹر پیام حیدرآباد، لفٹننٹ کرنل قریشی (آئی ایم ایس بمبئی) نیاز فتحپوری صاحب اڈیٹر نگار لکھنؤ۔ ڈاکٹر خلیفہ عبد الحکیم صاحب ایم اے ایل ایل بی پی ایچ ڈی (اس وقت پرنسپل امر سنگھ کالج سرینگر) مسٹر ہریندر ناتھ چٹو پادھیائے بمبئی، جیسے اہل الرائے صاحبان کے خیالات سے نہ صرف میں بلکہ عدالت بھی محروم رہی۔

میں نے ان کو اور دوسرے حضرات کو گواہی کی دعوت ان الفاظ میں دی تھی:۔

بمبئی۔ مورخہ ۲۰ ستمبر

مکرمی

تسلیمات۔ لاہور کی عدالت میں میرے ایک افسانے "دھواں" پر فحاشی کے الزام میں مقدمہ چل رہا ہے۔ میں نے آپ کو گواہ صفائی کے طور پر بلایا ہے۔ متذکرہ صدر افسانے کے بارے میں آپ کی جو رائے بھی ہو مجھے منظور ہوگی۔ اس لئے کہ فحاشی اور غیر فحاشی کے اہم موضوع پر آپ جیسے اہل الرائے ادیب اور صاحبِ قلم کے خیالات نہ صرف میرے لئے بلکہ ملکی ادب کے لئے مفید ہوں گے۔

مجھے امید ہے کہ آپ میری یہ دعوت قبول فرمائیں گے۔ شکریہ۔

نیاز کیش

سعادت حسن منٹو

سب نے میری دعوت قبول کی جس کے لئے میں شکر گذار ہوں۔۔ ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب سیکریٹری انجمن ترقی اردو "ہند" نے میرے عریضے کا جواب نہ دیا۔ بہت ممکن ہے ان تک پہنچا ہی نہ ہو۔ سردار دیوان سنگھ مفتون اڈیٹر ریاست کی طرف سے جب مجھے کوئی رسید نہ آئی تو مجھے بہت غصہ آیا۔ کیونکہ مجھے ان کی دوستی پر ناز ہے۔۔ میں نے پھر اُن کو لکھا۔ جواب آیا:۔

آپ کا دوسرا خط ملا۔ میرا داخلہ پنجاب میں منع ہے۔ اس لئے شہادت کیسے دوں۔ لیے بھی میں نے سمن پر لکھ دیا تھا۔ اگر مجسٹریٹ پنجاب گورنمنٹ سے اجازت لے لے تو میں جانے کے لئے تیار رہوں۔

ایک اور لطیفہ سنئے، بمبئی سے میں نے لاہور میں پروفیسر موہن سنگھ دیوانہ کو گواہی دینے کے لئے لکھا۔ سمن ان کے پاس پہلے پہونچ چکے تھے۔ میرا خط انہیں دیر کے بعد ملا۔ چنانچہ اُنہوں نے مجھے ایک کارڈ لکھا:۔

حضرت سلامت

آپ کے وکیل سے ایک مرتبہ پہلے ملاقات ہوئی تھی۔ اُنہوں نے نہ مقدمے کی وجہ بیان کی۔۔ نہ یہ کہا کہ کس افسانے پر دھرے گئے ہو۔ ہم کو پیشی تھی۔

دس بجے حاضرِ عدالت ہوا۔ سوا بارہ بجے تک دھوپ میں سڑتا رہا، ٹانگوں کو مسلتا اور بلغم نکالتا رہا۔ نہ جائے نشستن نہ اذنِ رفتن۔ سوا بارہ بجے بلوایا گیا۔ "کیوں جی۔ وہ کہانیاں تم نے پڑھی ہیں"۔ "حضور نہیں"۔ "برخواست"۔ لنگڑاتا لنگڑاتا گھر پہنچا۔ دیکھا کہ ایک بڑے پیٹ والا لفافہ لیٹر بکس سے جھانک رہا ہے۔ جس میں حضور کے ارشادات تھے۔ میرا قصور یہ ہے کہ میں بقصور ہوں۔ آپ خفا ہوں گے کہ ایک ہم پیشہ "قلم مار" نے یہ کیا حرکت کی۔ میں خفا ہوں کہ وکیل سست، مؤکل سست تر۔ غلطی کو سستی کی بیماری ہو۔ یقین نہیں آتا"۔

اور مجھے یہ یقین نہیں آتا کہ پروفیسر موہن سنگھ دیوانہ نے میری کہانیاں پڑھی ہی نہیں تھیں۔ غلطی مجھ سے بھی ہوئی کہ میں نے "بڑے پیٹ والے لفافے" عین اُس وقت بھیجے۔ جب کہ سمن جاری ہو چکے تھے۔ ان لفافوں میں میں نے اپنے اُس تحریری بیان کی نقل بھیجی تھی جو میں نے عدالت میں دیا تھا۔ چونکہ اس بیان کا میری تحریر سے دل گہرا تعلق ہے۔ اس لئے میں اسے ذیل میں نقل کرتا ہوں:۔

"میں ساقی بک ڈپو دہلی کی مطبوعہ کتاب بعنوان "دھواں" کا مصنّف ہوں۔ یہ کتاب میں نے ۱۹۴۱ء میں جبکہ میں آل انڈیا ریڈیو دہلی میں ملازم تھا، ساقی بک ڈپو کے مالک میاں شاہد احمد صاحب کے پاس غالباً تین یا ساڑھے تین سو روپے میں فروخت کی تھی۔ اس کے جملہ حقوق اشاعت

اب ساقی بک ڈپو کے پاس ہیں۔

اس کتاب کے جو نسخے میں نے عدالت میں دیکھے ہیں۔ اُن کے ملاحظے سے پتہ چلتا ہے کہ یہ کتاب کا دوسرا اڈیشن ہے۔

چوبیس افسانوں کے اس مجموعے میں جو انسانی زندگی کے مختلف شعبوں سے متعلق ہیں۔ دو افسانے بعنوان "دھواں" اور "کالی شلوار" استغاثے کے نزدیک عریاں اور فحش ہیں۔۔۔ مجھے اس سے اختلاف ہے۔ کیونکہ یہ دونوں کہانیاں عریاں اور فحش نہیں ہیں۔

کسی ادب پارے کے متعلق ایک روزنامہ اخبار کے اڈیٹر۔ ایک اشتہار فراہم کرنے والے اور ایک سرکاری مترجم کا فیصلہ صائب نہیں ہو سکتا بہت ممکن ہے کہ یہ تینوں کسی خاص اثر۔ کسی خاص غرض کے ماتحت اپنی رائے قائم کر رہے ہوں اور پھر یہ بھی ممکن ہے کہ تینوں حضرات ایسی رائے دینے کے اہل ہی نہ ہوں۔ کیونکہ کسی بڑے شاعر کسی بڑے افسانہ نگار کے افسانوں پر صرف وہی آدمی تنقید کر سکتا ہے جو تنقید نگاری کے فن کے تمام عواقب و عواطف سے آگاہ ہو۔

استغاثے نے میرے ان دو افسانوں پر کوئی بصیرت افروز تنقید نہیں کی۔ صرف اتنا کہہ دینے سے کہ یہ دونوں افسانے فحش ہیں۔ اس آدمی کی جو روشنی کا خواہشمند ہے جو اپنے عیوب و محاسن جاننا چاہتا ہے اور ان کی

اصلاح کرنا چاہتا ہے۔ ہرگز ہرگز تسکین نہیں ہوتی — میں اگر جواب میں صرف اتنا کہہ کر خاموش ہو جاؤں کہ یہ دونوں افسانے فحش نہیں ہیں، تو ظاہر ہے کہ میں اندھیرے میں اور بھی اضافہ کر دوں گا۔ مگر میں ایسا نہیں کروں گا۔ اور جہاں تک مجھ سے ہو سکے گا۔ اپنا مافی الضمیر بیان کرنے کی کوشش کروں گا

زبان میں بہت کم لفظ فحش ہوتے ہیں۔ طریقِ استعمال ہی ایک ایسی چیز ہے جو پاکیزہ سے پاکیزہ الفاظ کو بھی فحش بنا دیتا ہے۔ میرا خیال ہے۔ کوئی بھی چیز فحش نہیں لیکن گھر کی کرسی اور ہانڈی بھی فحش ہو سکتی ہے۔ اگر ان کو فحش طریقے پر پیش کیا جائے — چیزیں فحش بنائی جاتی ہیں کسی خاص غرض کے ماتحت

عورت اور مرد کا رشتہ فحش نہیں۔ اس کا ذکر بھی فحش نہیں۔ لیکن جب اس رشتے کو چوراسی آسنوں یا جوڑ دار خفیہ تصویروں میں تبدیل کر دیا جائے۔ اور لوگوں کو ترغیب دی جائے کہ وہ تخلیے میں اس رشتے کو غلط زاویے سے دیکھیں تو میں اس فعل کو صرف فحش ہی نہیں بلکہ نہایت گھناؤنا۔ مکروہ اور غیر صحت مند کہوں گا۔

فحش اور غیر فحش میں تمیز کرنے کے لئے شاید یہ مثال کام دے سکے۔

ایک آرٹ گیلری میں نمائش کے لئے ننگی عورتوں کی بہت سی تصویریں پیش ہوئیں۔ ان میں سے کسی نے بھی جیسا کہ ظاہر ہے۔ دیکھنے والوں کا اخلاق خراب نہ کیا اور نہ ان کے شہوانی جذبات ہی کو ابھارا۔ البتہ ایک تصویر

جس میں عورت کا سارا بدن کپڑوں میں مستور تھا اور ایک خاص حصّہ اس ترکیب سے نیم عریاں چھوڑ دیا گیا تھا۔ کہ دیکھنے والوں کے جذبات میں گدگدی سی ہوتی تھی فحش قرار دی گئی۔ کیوں؟ — اس لئے کہ آرٹسٹ کی نیت میں فرق تھا اور اس نے جان بوجھ کر لباس کو کچھ اس طرح اوپر اٹھا دیا تھا کہ دیکھنے والوں کے دل و دماغ میں ہلچل سی مچ جائے اور وہ اپنے تصوّر سے مدد لے کر اس نیم عریاں حصے کو عریاں دیکھنے کی کوشش کریں۔

تحریر و تقریر میں، شعر و شاعری میں، سنگ سازی و صنم تراشی میں فحاشی تلاش کرنے کے لئے سب سے پہلے اس کی ترغیب ٹٹولنی چاہئے۔ اگر یہ ترغیب موجود ہے، اگر اس کی نیت کا ایک شائبہ بھی نظر آرہا ہے تو وہ تحریر، وہ تقریر وہ شعر، وہ بُت قطعی طور پر فحش ہے۔

اب ہمیں دیکھنا ہے کہ یہ ترغیب "دھواں" میں موجود ہے یا نہیں —

آیئے ہم اس افسانے کا تجزیہ کرتے ہیں۔

مسعود ایک کم سن لڑکا ہے غالباً دس بارہ برس کا — اس کے جسم میں جنسی بیداری کی پہلی لہر کس طرح پیدا ہوتی ہے۔ یہ اس افسانے کا موضوع ہے۔ ایک خاص فضا اور چند خاص چیزوں کا اثر بیان کیا گیا ہے جو مسعود کے جسم میں دھندلے دھندلے خیالات پیدا کرتا ہے۔ ایسے خیالات جن کا رجحان جنسی بیداری کی طرف ہے۔ یہ بیداری وہ سمجھ نہیں سکتا۔ لیکن نیم شعوری طور پر محسوس ضرور کرتا ہے۔

بے کھال کا بکرا جس میں سے دھواں اٹھتا ہے۔ سردیوں کا ایک دن جب کہ بادل گھرے ہوتے ہیں اور آدمی سردی کے باوجود ایک میٹھی میٹھی حرارت محسوس کرتا ہے۔ ہانڈی جس میں سے بھاپ اٹھ رہی ہے۔ بہن جس کی ٹانگیں ننگی ہوتی ہیں ـــ یہ سب عناصر مل کر مسعود کے بدن میں جنسی بیداری پیدا کرتے ہیں۔ جوانی کی اس پہلی انگڑائی کو وہ غریب سمجھ نہیں سکتا اور انجام کار اپنی ماں کی ٹانگیں توڑنے کی ناکام سعی کرتا کرتا تھک جاتا ہے ـــ یہ تھکاوٹ اس بے نام سی چنگاری کو، اس "کچھ کرنے" کی تحریک کو دبا دیتی ہے۔

"دھواں" میں شروع سے لے کر آخر تک ایک کیفیت، ایک جذبے ایک تحریک کا نہایت ہی ہموار نفسیاتی بیان ہے۔ اصل موضوع سے ہٹ کر اس میں دور از کار باتیں نہیں کی گئیں۔ اس میں ہمیں کہیں بھی ایسی ترغیب نظر نہیں آتی جو قارئین کو شہوانی لذتوں کے دائرے میں لے جائے۔ اس لئے کہ افسانے کا موضوع "شہوت" نہیں ہے۔ استغفاللہ اگر ایسا سمجھتا ہے تو یہ اس کی کم نظری ہے ـــ

خشخاش کے دانے افیم کی گولی بننے تک کافی مرحلے طے کرتے ہیں۔

میں نے اس کہانی میں کوئی سبق نہیں دیا۔ اخلاقیات پر یہ کوئی لکچر بھی نہیں کیونکہ میں خود کو نام نہاد ناصح یا معلم اخلاق نہیں سمجھتا۔ البتہ اتنا ضرور سمجھتا ہوں کہ اس لڑکے کو مضطرب کرنے والی چیزیں خارجی تھیں۔ انسان اپنے اندر کوئی برائی لے کر پیدا نہیں ہوتا۔ خوبیاں اور برائیاں اس کے دل و دماغ میں باہر سے

داخل ہوتی ہیں۔ بعض ان کی پرورش کرتے ہیں۔ بعض نہیں کرتے۔ میرے نزدیک تصاویروں کی دکانیں فحش ہیں۔ کیونکہ ان میں ننگے گوشت کی بہت بدنما اور بھدے طور پر نمائش کی جاتی ہے۔ میرے نزدیک وہ ماں باپ اپنی اولاد کو جنسی بیداری کا موقعہ دیتے ہیں جو دن کو بند کمروں میں کئی کئی گھنٹے اپنی بیوی کا سر دبونے کا بہانہ لگا کر اس سے ہم بستری کرتے ہیں۔

ہندوستان میں بچوں کے اندر بہت کم سنی ہی میں جنسی بیداری پیدا ہو جاتی ہے۔ اس کی وجہ کسی حد تک آپ کو میرے افسانے کے مطالعے سے معلوم ہو سکتی ہے۔ اتنی چھوٹی عمر میں جنسی بیداری کا پیدا ہونا میرے نزدیک بہت ہی بھونڈی چیز ہے۔ یعنی اگر میں کسی چھوٹے بچے کو جنسیات کی طرف راغب دیکھوں تو مجھے کوفت ہوگی۔ میرے جمالیاتی جذبات کو صدمہ پہنچے گا۔

افسانہ نگار اس وقت اپنا قلم اٹھاتا ہے جب اس کے جذبات کو صدمہ پہنچتا ہے۔ مجھے یاد نہیں کیونکہ بہت عرصہ گذر چکا ہے۔ لیکن "دھواں" لکھنے سے پہلے مجھے کوئی منظر۔ کوئی اشارہ یا کوئی واقعہ دیکھ کر ضرور ایسا صدمہ پہنچا ہوگا جو افسانہ نگار کے قلم کو حرکت بخشتا ہے۔

افسانے کا مطالعہ کرنے سے یہ امر اچھی طرح واضح ہو سکتا ہے کہ میں نے اس بے نام سی لذت میں جو مسعود کو محسوس ہو رہی تھی۔ خود کو یا قارئین کو کہیں شریک نہیں کیا۔ یہ ایک اچھے فن کار کے قلم کی خوبی ہے

اس افسانے میں سے میں چند سطور پیش کرتا ہوں جن سے افسانہ نگار کے غائت درجہ محتاط ہونے کا پتہ چلتا ہے۔ اس نے کہیں بھی مسعود کے دماغ میں شہوانی خیالات کی موجودگی کا ذکر نہیں کیا۔ ایسی لغزش افسانے کا ستیاناس کر دیتی

۱۔ مسعود کے وزن کے نیچے کلثوم کی چوڑی چکلی کمر میں خفیف سا جھکاؤ پیدا ہوا۔ جب اس نے پیروں سے دبانا شروع کیا۔ ٹھیک اسی طرح جس طرح مزدور مٹی گوندھتے ہیں تو کلثوم نے مزا لینے کی خاطر ہولے ہولے ہائے ہائے کرنا شروع کیا۔

۲۔ کلثوم کی پنڈلیوں میں اکڑی ہوئی مچھلیاں اس کے پیروں کے نیچے دب دب کر ادھر ادھر پھسلنے لگیں۔ مسعود نے ایک بار اسکول میں تنے ہوئے رسے پر ایک بازیگر کو چلتے دیکھا تھا۔ اس نے سوچا کہ بازیگر کے پیروں کے نیچے تنا ہوا رسّا بھی اسی طرح پھسلتا ہوگا۔

۳۔ بکرے کے گرم گرم گوشت کا اُسے بار بار خیال آتا تھا۔ ایک دو مرتبہ اُس نے سوچا: "کلثوم کو اگر ذبح کیا جائے تو کھال اترنے پر کیا اُس کے گوشت میں سے دھواں نکلے گا؟" لیکن ایسی بیہودہ باتیں سوچنے پر اُس نے اپنے آپ کو مجرم محسوس کیا اور دماغ کو اُسی طرح صاف کر دیا۔ جس طرح وہ سلیٹ کو اسفنج سے صاف کیا کرتا تھا۔

خط کشیدہ الفاظ اس بات کے ضامن ہیں کہ مسعود کا ذہن کہیں بھی شہوت سے ملوث نہیں ہوا۔ وہ اپنی بہن کی کمر دباتا ہے۔ جس طرح مزدور مٹی گوندھتے

ہیں۔ٹانگیں دباتا ہے تو اس کا خیال بازیگر کی طرف چلا جاتا ہے جس کا تماشا اُس نے ایک بار اپنے اسکول میں دیکھا تھا اور جب یہ سوچتا ہے کہ اُس کی بہن ذبح کر دی جائے تو کیا اس کے گوشت میں سے دھواں نکلے گا تو فوراً اُسے بری بات سمجھ کر اپنے دماغ سے نکال دیتا ہے اور خود کو مجرم سمجھتا ہے

خدا جانے استغاثہ اس افسانے کو فحش کیوں کہتا ہے جس میں فحاشی کا شائبہ تک موجود نہیں۔ اگر میں کسی عورت کے سینے کا ذکر کرنا چاہوں گا تو اسے عورت کا سینہ ہی کہوں گا۔عورت کی چھاتیوں کو آپ مونگ پھلی، میز یا استرہ نہیں کہہ سکتے — یوں تو بعض حضرات کے نزدیک عورت کا وجود ہی فحش ہے مگر اس کا کیا علاج ہو سکتا ہے۔

میں ایسے لوگوں کو بھی جانتا ہوں۔جن کو بکری کا ایک معصوم بچہ بھی معصیت کی طرف لے جاتا ہے۔ دنیا میں ایسے اشخاص بھی موجود ہیں جو مقدس کتابوں سے شہوانی لذت حاصل کرتے ہیں اور ایسے انسان بھی آپ کو مل جائیں گے۔ لوہے کی مشینیں جن کے جسم میں شہوت کی حرارت پیدا کر دیتی ہیں — مگر لوہے کی ان مشینوں کا جیسا کہ آپ سمجھ سکتے ہیں۔ کوئی قصور نہیں۔ اسی طرح نہ بکری کے معصوم بچے کا اور نہ مقدس کتابوں کا۔

ایک مریض جسم۔ ایک بیمار ذہن ہی ایسا غلط اثر لے سکتا ہے جو لوگ روحانی، ذہنی اور جسمانی لحاظ سے تندرست ہیں۔ اصل میں انہی کے لئے

شاعر شعر کہتا ہے۔ افسانہ نگار افسانہ لکھتا ہے اور مصوّر تصویر بناتا ہے۔
میرے افسانے تندرست اور صحت مند لوگوں کے لئے ہیں۔ نورمل انسانوں کیلئے جو عورت کے سینے کو عورت کا سینہ ہی سمجھتے ہیں اور اس سے زیادہ آگے نہیں بڑھتے۔ جو عورت اور مرد کے رشتے کو استعجاب کی نظر سے نہیں دیکھتے۔ جو کسی ادب پارے کو ایک ہی دفعہ نگل نہیں جاتے۔
روٹی کھانے کے متعلق ایک موٹا سا اصول ہے کہ ہر لقمہ اچھی طرح چبا کر کھاؤ۔ لعاب دہن میں اسے خوب حل ہونے دو تاکہ معدے پر زیادہ بوجھ نہ پڑے اور اس کی غذائیت برقرار رہے۔ پڑھنے کے لئے بھی یہی موٹا اصول ہے کہ ہر لفظ کو۔ ہر سطر کو۔ ہر خیال کو اچھی طرح ذہن میں چباؤ۔ اس لعاب کو جو پڑھنے سے تمہارے دماغ میں پیدا ہوگا۔ اچھی طرح حل کرو تاکہ جو کچھ تم نے پڑھا ہے۔ اچھی طرح ہضم ہو سکے۔ اگر تم نے ایسا نہ کیا تو اس کے نتائج بُرے ہوں گے۔ جس کے لئے تم لکھنے والے کو ذمہ دار نہ ٹھہرا سکو گے۔ وہ روٹی جو اچھی طرح چبا کر نہیں کھائی گئی۔ تمہاری بدہضمی کی ذمہ دار کیسے ہو سکتی ہے۔
میں ایک مثال سے اس کی وضاحت کرنا چاہتا ہوں۔۔ فرانس میں ایک بہت بڑا افسانہ نگار گائی۔ دی موپاساں گذرا ہے۔ جنسیات اس کا محبوب موضوع تھا۔ بڑے بڑے ڈاکٹروں اور ماہرین نفسیات نے اس کے افسانوں کا اپنی علمی کتابوں میں حوالہ دیا ہے۔ اپنے ایک افسانے میں وہ ایک

لڑکے اور ایک لڑکی کی داستان بیان کرتا ہے جو بے حد الھڑ تھے۔ پہلی رات کے متعلق دونو نے سنی سنائی باتوں سے ایک عجیب وغریب تصویر اپنے ذہن میں کھینچ رکھی تھی۔ دونو اس خیال سے کپکپا رہے تھے۔ کہ خدا معلوم کتنی بڑی لذت ان کو پہلی رات کے ملاپ سے ملے گی۔

دونو کی شادی ہوگئی ـــ دولھا ماہِ عسل منانے کی خاطر دلھن کو ایک ہوٹل میں لے گیا۔ وہاں پہلی رات کو ـــ اس رات کو جس میں دونو کے خیال کے مطابق شاید فرشتے اُتر کر ان کو لوریاں دینے والے تھے۔ دولھا اور دلھن ہم بستر ہوگئے ـــ دونو لیٹے تھے اور بس ـــ دلھن نے شامتِ اعمال سے اتنا کہہ دیا "بس ـــ کیا یہی ہماری پہلی رات تھی جس کے ہم دونو اتنے شیریں خواب دیکھا کرتے تھے" ـــ دولھا کو یہ بات کھا گئی۔ آخر مرد ہی تو تھا۔ اس نے سوچا یہ میری مردانگی پر حملہ ہے ـــ چنانچہ اُس کی مردانگی بالکل ہی ختم ہوگئی ـــ عرقِ ندامت میں غرق وہ حجرۂ عروسی سے باہر نکل گیا۔ اس غرض سے کہ اپنی ناکام زندگی کسی دریا کے سپرد کر دے۔ عین اُس وقت جب یہ نیا نویلا دولھا اس خطرناک فیصلے پر پہنچا۔ فرانس کی ایک کسبی ـــ ایک دیشیا پاس سے گذری جو غالباً گاہک تلاش کر رہی تھی۔ اس عصمت باختہ عورت نے اُس کو اشارہ کیا۔ دولھا نے محض انتقام لینے کے لئے ـــ ساری عورت ذات سے بدلہ لینے کے لئے اُس کو اس اشتلیے کا

جواب دیا، کہ ہاں میں تیار ہوں۔ وہ گھبائی اسے اپنے گھر لے گئی۔ اس کے غلیظ گھر میں وہ وہاں وہ کام کرنے میں کامیاب ہو گیا جو وہ اپنے نفیس ہوٹل کے حجرۂ عروسی میں نہ کر سکا تھا۔ اب وہ اس ویشیا کو بھول گیا۔ دوڑا دوڑا اپنی نئی بیاہتا بیوی کے پاس پہنچا جیسے اسے اپنی کھوئی ہوئی دولت مل گئی ہے۔ دونو پاس پاس لیٹے تھے مگر اب اس کی بیوی کو وہ شیریں خواب دیکھنے کی خواہش باقی نہیں رہی تھی جس کا اس نے پہلے گلہ کیا تھا۔

یہ افسانہ پڑھ کر اگر کوئی شخص جو پہلی رات کو ناکام رہا ہو سیدھا ویشیا کے کوٹھے کا رخ کرے تو میں سمجھتا ہوں۔ اس جیسا چغد اور کوئی نہیں ہوگا۔ میرے ایک دوست نے یہی بیوقوفی کی اور اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اسے اپنا کھویا ہوا وقار تو مل گیا۔ پر اس کے ساتھ ہی ایک مکروہ مرض چمٹ گیا۔ جس کے علاج کے لئے اسے کافی سے زیادہ زحمت اٹھانا پڑی۔

پچھلے دنوں میں نے آل انڈیا ریڈیو بمبئی سے ایک تقریر نشر کی تھی اس میں میں نے کہا تھا۔

"ادب ایک فرد کی اپنی زندگی کی تصویر نہیں۔ جب کوئی ادیب قلم اٹھاتا ہے تو وہ اپنے گھریلو معاملات کا روزنامچہ پیش نہیں کرتا۔ اپنی ذاتی خواہشوں سے خوشیوں۔ رنجشوں۔ بیماریوں اور تندرستیوں کا ذکر نہیں کرتا۔ اس کی قلمی تصویروں میں بہت ممکن ہے۔ آنسو اس کی دکھی بہن کے ہوں مسکراہٹیں

آپ کی ہوں اور قہقہے ایک خستہ حال مزدور کے ۔۔۔ اس لئے اپنی مسکراہٹوں
اپنے آنسوؤں اور اپنے قہقہوں کی ترازو میں ان تصویروں کو تولنا بہت
بڑی غلطی ہے۔۔ ہر ادب پارہ ایک خاص فضا۔ ایک خاص اثر۔ ایک خاص
مقصد کے لئے پیدا ہوتا ہے۔ اگر اس میں یہ خاص فضا۔ یہ خاص اثر اور
یہ خاص مقصد محسوس نہ کیا جائے تو یہ ایک بے جان لاش رہ جائے گی"۔

میں ایک زمانے سے لکھ رہا ہوں۔ گیارہ کتابوں کا مصنف و مؤلف
ہوں۔ آل انڈیا ریڈیو کے تقریباً ہر اسٹیشن سے میرے ڈرامے اور فیچر
براڈکاسٹ ہوتے رہتے ہیں۔ ان کی تعداد سو سے اوپر ہے۔۔۔ میں
تحریر و تصنیف کے جملہ آداب سے واقف ہوں ۔۔ میرے قلم سے بے ادبی
شاذو نادر ہی ہو سکتی ہے۔۔ میں فحش نگار نہیں۔ افسانہ نگار ہوں۔

دوسرے افسانے "کالی شلوار" کے متعلق میں نے اس لئے کچھ نہیں
کہا کہ لاہور کی سیشن کورٹ میں فحاشی سے بری قرار دی جا چکی ہے۔

میرے اس بیان کا کچھ اثر نہ ہوا۔ صفائی کے گواہوں میں ڈاکٹر سعید اللہ ایم اے
ایل، ایل، بی، پی، ایچ ڈی، ڈی ایس سی، پروفیسر کنہیا لال کپور ایم اے ایل ایل بی،
ڈاکٹر آئی لطیف ایم اے پی، ایچ۔ ڈی۔ مولانا باری علیگ۔ دیوندر ستیارتھی۔
جیسی اہل الرائے ہستیاں موجود تھیں۔۔ ان حضرات نے اپنا قیمتی وقت ضائع کر کے
سارا سارا دن عدالت میں گذار کر میرے حق میں گواہی دی اور کہا کہ زیر عتاب افسانوں میں

فحاشی کا شائبہ بھی موجود نہیں۔ لیکن رائے صاحب لالہ سنت رام نے دونو افسانے فحش قرار دیئے اور مجھے دوسو روپیہ جرمانہ ادا کرنے کی سزا دی (عدم ادائیگی جرمانہ کی صورت میں کتنے مہینوں کی قید با مشقت تھی۔ تھی یا نہیں۔ اس کا مجھے علم نہیں)۔۔۔ میں نے جب اپنی جیب سے دوسو روپے نکالے تو اسپیشل مجسٹریٹ صاحب کے ہونٹوں پر ایک اسپیشل مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ آپ نے کہا ''ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ کیل کانٹے سے لیس ہو کر آئے تھے۔''

باوجود کوشش کے میرے ہونٹوں پر اسپیشل مسکراہٹ پیدا نہ ہو سکی۔

سیشن میں اپیل کی گئی۔ پیروی مسٹر ہیرالال سبیل نے کی۔ کئی مہینے گذرنے پر ایک روز اُن کا تار آیا۔ کہ مبارک ہو سیشن کورٹ نے اپیل منظور کر لی ہے۔ جرمانہ واپس ہو جائے گا۔

تیسری دفعہ انجام بخیر ہوا۔

ایک اور لطیفہ سنئے ۔۔۔ چند روز ہوئے۔ ایک صاحب مجھ سے ملنے آئے۔ میں نے نوکر سے کہا ''پوچھو کون ہے؟'' ۔۔۔ جواب آیا ''سی آئی ڈی کا آدمی'' ۔۔۔ ظاہر ہے کہ لاہور سے گرفتاری کا وارنٹ تھا۔ لیکن جب میں اس سی آئی ڈی کے آدمی سے ملا اور اس سے کہا ''فرمایئے اب کی میری کس کہانی پر عتاب نازل ہوا ہے'' تو وہ جیسے کچھ سمجھا ہی نہیں۔ کہنے لگا ''ادھر ہم تپاس (پوچھ گچھ) کرنے آیا ہے۔ تمہارا نام ادھر کمیونسٹ پارٹی کے آفس میں چوپڑی (کتاب) میں لکھا تھا... بولو تمہارا کیا تعلق ہے

اس سے؟"

یہ سُنکر مجھے تسلی ہوئی اور مذاق سوجھا "چوپڑی سے یا کمیونسٹ پارٹی سے؟"

"کمیونسٹ پارٹی سے!"

میں نے جواب دیا "تعلق ہے مگر ناجائز۔"

"کیوں؟"

"اس لئے کہ تمہاری حکومت یہی سمجھتی ہے۔ ورنہ تم یہاں تیاس کرنے کیوں آتے"

یہ قصہ بھی ختم ہوا۔

آخر میں اُن تمام حضرات کا شکریہ ادا کرنا میں اپنا فرض سمجھتا ہوں جنہوں نے لاہور کی ایسی عدالت میں جہاں شریف انسانوں کو بیٹھنے کے لئے ایک ٹوٹی ہوئی کرسی بھی نہیں تھی، گھنٹوں اپنا قیمتی وقت ضائع کرکے بھینسوں کے آگے بین بجائی۔

مسٹر اے ایس بخاری کا بھی ممنون و متشکر ہوں۔ متذکرہ صدر مقدمے کے فیصلے کے بعد یا اس سے کچھ دیر پہلے آپنے بمبئے ریڈیو اسٹیشن میں مجھے بلایا اور بڑی شفقت سے بتایا کہ "وہ اور ڈاکٹر محمد دین تاثیر میرے اور عصمت کے عتاب زدہ افسانوں کے متعلق ہندوستان کے مشہور ادیبوں کی رائے مرتب کرنے والے ہیں اور یہ کہ انہوں نے لاہور کی عدالت کے بیانات وغیرہ کی نقل لینے کے لئے ایک آدمی بھی متعین کردیا ہے۔" یہ سن کر مجھے بہت خوشی ہوئی۔ آپنے اتفاق سے میرا افسانہ "دھواں" نہیں پڑھا تھا۔ چنانچہ اُن کے ارشاد کے مطابق ایک جلد اس کتاب کی ان کو دہلی روانہ کردی۔ اس ملاقات کو تقریباً ایک برس ہوچکا ہے۔ امید ہے بخاری صاحب نے اپنا کام ختم کرلیا ہوگا۔

سعادت حسن منٹو

بمبئی۔ ۲۷ فروری ۱۹۴۲ء

بُو

برسات کے یہی دن تھے۔ کھڑکی کے باہر پیپل کے پتے اسی طرح نہا رہے تھے۔ ساگوان کے اس سپرنگوں والے پلنگ پر جو اب کھڑکی کے پاس سے ذرا ادھر کو سرکا دیا گیا تھا۔ ایک گھاٹن لونڈیا رندھیر کے ساتھ چمٹی ہوئی تھی۔

کھڑکی کے باہر پیپل کے پتے رات کے دودھیالے اندھیرے میں جھمکوں کی طرح تھرتھرا رہے تھے اور نہا رہے تھے اور وہ گھاٹن لونڈیا رندھیر کے ساتھ کپکپاہٹ بن کر چمٹی تھی۔ شام کے قریب، دن بھر ایک انگریزی اخبار کی تمام خبریں اور اشتہار پڑھنے کے بعد جب وُہ بالکنی میں ذرا تفریح کی خاطر آ کھڑا ہوا تھا تو اس نے اس گھاٹن لڑکی کو جو غالباً ساتھ والے رسیّوں کے کارخانے میں کام کرتی تھی اور بارش سے بچنے کے لئے املی کے درخت کے نیچے کھڑی تھی۔ کھانس کھنکار کر اپنی طرف متوجہ کیا تھا اور آخر میں ہاتھ کے اشارے سے اُوپر بلا لیا تھا۔

وہ کئی دنوں سے شدید قسم کی تنہائی محسوس کر رہا تھا۔ جنگ کے باعث بمبئی کی قریب قریب تمام کرسچین چھوکریاں جو پہلے سستے داموں پر مل جاتی تھیں۔ عورتوں کی انگریزی فورس میں بھرتی ہو گئی تھیں۔ ان میں سے بعض نے فورٹ کے علاقے میں ڈانسنگ اسکول کھول لئے تھے۔ جہاں صرف فوجی گوروں کو جانے کی اجازت تھی ۔۔۔ رندھیر بہت اداس ہو گیا تھا۔ اس کی اداسی کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ کرسچین چھوکریاں نایاب ہو گئی تھیں۔ دوسری وجہ یہ بھی تھی ۔ کہ رندھیر جو فوجی گوروں کے مقابلے میں کہیں زیادہ مہذّب، تعلیم یافتہ، صحت مند اور خوبصورت تھا۔ صرف اس لئے اس پر فورٹ کے اکثر قحبہ خانوں کے دروازے بند کر دیئے گئے تھے کہ اُس کی چمڑی سفید نہیں تھی۔

جنگ سے پہلے رندھیر، ناگپاڑہ اور تاج ہوٹل کے گرد و نواح کی کئی کرسچین لڑکیوں سے جسمانی ملاقات کر چکا تھا۔ اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ ایسی ملاقات کے آداب سے وُہ ان کرسچین لونڈوں کے مقابلے میں کہیں زیادہ واقفیت رکھتا ہے۔ جن سے یہ لڑکیاں فیشن کے طور پر رومانس لڑاتی ہیں اور بعد میں کسی چغد سے شادی کر لیتی ہیں۔

رندھیر نے محض دل ہی دل میں ہیزل سے اس کی تازہ تازہ پیدا شدہ رعونت کا بدلہ لینے کی خاطر اس گھاٹن لڑکی کو اشارے سے اوپر بلایا تھا۔ ہیزل اُس کے فلیٹ کے نیچے رہتی تھی اور ہر روز صبح کو وردی پہن کر اور اپنے کٹے ہوئے

بالوں پر خاکی رنگ کی ٹوپی ترچھے زاویے پر جما کر باہر نکلتی تھی اور اس انداز سے چلتی تھی۔ گویا فٹ پاتھ پر تمام جانے والے اس کے قدموں کے آگے ٹاٹ کی طرح بچھتے چلے جائیں گے۔

رندھیر نے سوچا تھا کہ آخر وہ کیوں ان کرسچین چھوکریوں کی طرف اتنا راغب ہے اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ اپنے جسم کی تمام قابل نمائش چیزوں کی اچھی طرح نمائش کرتی ہیں۔ کسی قسم کی جھجک محسوس کئے بغیر اپنے ایام کی بے ترتیبی کا ذکر کر دیتی ہیں۔ اپنے پرانے معاشقوں کا حال سناتی ہیں۔ جب ڈانس کی دھن سنتی ہیں تو اپنی ٹانگیں تھرکانا شروع کر دیتی ہیں — یہ سب ٹھیک ہے لیکن کوئی عورت بھی ان تمام خوبیوں کی حامل ہو سکتی ہے۔

رندھیر نے جب گھاٹن لڑکی کو اشارے سے اوپر بلایا تھا تو اسے ہرگز ہرگز یقین نہیں تھا کہ وہ اس کو اپنے ساتھ سلائے گا۔ لیکن تھوڑی ہی دیر کے بعد جب اس نے اس کے بھیگے ہوئے کپڑے دیکھ کر یہ خیال کیا تھا۔ کہیں ایسا نہ ہو، بیچاری کو نمونیہ ہو جائے، تو رندھیر نے اُس سے کہا تھا "یہ کپڑے اتار دو، سردی لگ جائے گی۔"

وہ اس کا مطلب سمجھ گئی تھی۔ کیونکہ اُس کی آنکھوں میں شرم کے لال ڈورے تیر گئے تھے مگر بعد میں جب رندھیر نے اُسے اپنی سفید دھوتی نکال کر دی۔ تو اس نے کچھ دیر سوچ کر اپنا کاشٹا کھولا جس کا میل بھیگنے کے باعث اور زیادہ

ابھر آیا تھا۔ کاشٹا کھول کر اس نے ایک طرف رکھ دیا اور جلدی سے سفید دھوتی اپنی رانوں پر ڈال لی۔ پھر اس نے اپنی پھنسی پھنسی چولی اتارنے کی کوشش شروع کی جس کے دونوں کناروں کو ملا کر اس نے ایک گانٹھ دے رکھی تھی۔ یہ گانٹھ اس کے تندرست سینے کے ننھے مگر میلے گڑھے میں جذب سی ہو گئی تھی۔

دیر تک وہ اپنے گھسے ہوئے ناخنوں کی مدد سے چولی کی گرہ کھولنے کی کوشش کرتی رہی جو بارش کے پانی سے بہت زیادہ مضبوط ہو گئی تھی۔ جب تھک ہار گئی تو اس نے مرہٹی زبان میں رندھیر سے کچھ کہا جس کا مطلب یہ تھا "میں کیا کروں نہیں کھلتی۔"

رندھیر اس کے پاس بیٹھ گیا اور گرہ کھولنے لگا۔ تھک ہار کر اس نے ایک ہاتھ میں چولی کا ایک سرا پکڑا۔ دوسرے ہاتھ میں دوسرا اور زور سے کھینچا۔ گرہ ایک دم پھسلی، رندھیر کے ہاتھ زور میں ادھر ادھر ہٹے اور دو دھڑکتی ہوئی چھاتیاں نمودار ہوئیں۔ رندھیر نے ایک لحظے کے لئے خیال کیا کہ اس کے اپنے ہاتھوں نے اس گھاٹن لڑکی کے سینے پر نرم نرم گندھی ہوئی مٹی کو چابکدست کمہار کی طرح دو پیالوں کی شکل دے دی ہے۔

اس کی صحت مند چھاتیوں میں وہی گدراہٹ، وہی جاذبیت، وہی طراوت وہی گرم گرم ٹھنڈک تھی جو کمہار کے ہاتھوں سے نکلے ہوئے تازہ تازہ کچے برتنوں میں ہوتی ہے۔

مٹیلے رنگ کی ان جوان چھاتیوں میں جو بالکل بے داغ تھیں ایک عجیب قسم کی چمک محلول تھی۔ سیاہی مائل گندمی رنگ کے نیچے دھندلی روشنی کی ایک تہ سی تھی جس نے یہ عجیب و غریب چمک پیدا کر دی تھی جو چمک ہونے کے باوجود چمک نہیں تھی۔ اُس کے سینے پر چھاتیوں کے یہ ابھار دو دیے معلوم ہوتے تھے۔ جو تالاب کے گدلے پانی کے اندر جل رہے ہوں۔

برسات کے یہی دن تھے۔ کھڑکی کے باہر پیپل کے پتّے اسی طرح کپکپا رہے تھے۔ اس گھاٹی لڑکی کے دونو کپڑے جو پانی سے شرابور ہو چکے تھے۔ ایک غلیظ ڈھیری کی شکل میں فرش پر پڑے تھے اور وہ رندھیر کے ساتھ چمٹی ہوئی تھی۔ اس کے ننگے اور میلے بدن کی گرمی رندھیر کے جسم میں وہ کیفیت پیدا کر رہی تھی جو سخت سردیوں میں نائیوں کے غلیظ مگر گرم حمام میں نہاتے وقت محسوس ہوا کرتی تھی۔

ساری رات وہ رندھیر کے ساتھ چمٹی رہی۔ دونو گویا ایک دوسرے میں مدغم ہو گئے تھے۔ انہوں نے بمشکل ایک دو باتیں کی ہوں گی۔ کیونکہ جو کچھ انہیں کہنا سننا تھا۔ سانسوں، ہونٹوں اور ہاتھوں سے طے ہوتا رہا تھا۔ رندھیر کے ہاتھ ساری رات اس کی چھاتیوں پر ہوائی لمس کی طرح پھرتے رہے۔ چھوٹی چھوٹی چوچیاں اور وہ موٹے موٹے مسام جو ان کے اردگرد ایک کالے دائرے کی شکل میں پھیلے ہوئے تھے۔ اس ہوائی لمس سے بھی جاگ اُٹھتے اور اس گھاٹن لڑکی کے سارے جسم میں ایسا ارتعاش پیدا ہو جاتا کہ رندھیر خود بھی ایک لحظے

کے لیے کپکپا اٹھتا۔

ایسی کپکپاہٹوں سے رندھیر کا سینکڑوں مرتبہ تعارف ہو چکا تھا۔ وہ اس کی لذت سے اچھی طرح آشنا تھا۔ کئی لڑکیوں کے نرم اور سخت سینوں کے ساتھ اپنا سینہ ملا کر وہ ایسی راتیں گزار چکا تھا۔ وہ ایسی لڑکیوں کے ساتھ بھی رہ چکا تھا جو بالکل الھڑ تھیں اور اس کے ساتھ لپٹ کر گھر کی وہ تمام باتیں سنا دیا کرتی تھیں جو کسی غیر کو نہیں سنانا چاہئیں، وہ ایسی لڑکیوں سے بھی جسمانی رشتہ قائم کر چکا تھا جو ساری مشقت خود کرتی تھیں اور اسے کوئی تکلیف نہیں دیتی تھیں۔ مگر یہ گھاٹن لڑکی جو املی کے درخت کے نیچے بھیگی ہوئی کھڑی تھی اور جس کو اس نے اشارے سے اوپر بلا لیا تھا۔ بہت ہی مختلف تھی۔

ساری رات رندھیر کو اس کے بدن سے عجیب و غریب قسم کی بو آتی رہی تھی۔ اس بو کو جو بیک وقت خوشبو اور بدبو تھی۔ وہ تمام رات پیتا رہا تھا۔ اس کی بغلوں سے، اس کی چھاتیوں سے، اس کے بالوں سے، اس کے پیٹ سے ہر جگہ سے یہ بو جو بدبو بھی تھی اور خوشبو بھی رندھیر کے ہر سانس میں موجود ہوتی تھی تمام رات وہ سوچتا رہا تھا کہ یہ گھاٹن لڑکی بالکل قریب ہونے پر بھی ہرگز ہرگز اتنی زیادہ قریب نہ ہوتی۔ اگر اس کے ننگے بدن سے یہ بو نہ اڑتی — یہ بو جو اس کے دل و دماغ کی ہر سلوٹ میں رینگ گئی تھی۔ اس کے تمام پرانے اور نئے خیالوں میں رچ گئی تھی۔

اس بُو نے اس لڑکی کو اور رندھیر کو ایک رات کے لئے آپس میں حل کر دیا تھا۔ دونوں ایک دوسرے کے اندر داخل ہو گئے تھے۔ عمیق ترین گہرائیوں میں اُتر گئے تھے۔ جہاں پہنچ کر وہ ایک خالص انسانی لذّت میں تبدیل ہو گئے تھے۔ ایسی لذّت جو لمحاتی ہونے کے باوجود دائمی تھی۔ جو مائلِ پرواز ہونے کے باوجود ساکن اور جامد تھی — وہ دونوں ایک ایسا پنچھی بن گئے تھے جو آسمان کی نیلاہٹوں میں اڑتا اڑتا غیر متحرک دکھائی دیتا ہے۔

اس بُو کو جو اس گھاٹن لڑکی کے ہر مسام سے باہر نکلتی تھی۔ رندھیر اچھی طرح سمجھتا تھا۔ حالانکہ وہ اس تجزیہ نہیں کر سکتا تھا۔ جس طرح بعض اوقات مٹّی پر پانی چھڑکنے سے سوندھی سوندھی باس پیدا ہوتی ہے۔ . . . لیکن نہیں، وہ بُو کچھ اور ہی قسم کی تھی، اس میں لونڈر اور عطر کا مصنوعی پن نہیں تھا۔ وہ بالکل اصلی تھی — عورت اور مرد کے باہمی تعلقات کی طرح اصلی اور ازلی۔

رندھیر کو پسینے کی بو سے سخت نفرت تھی۔ وہ نہانے کے بعد عام طور پر اپنی بغلوں وغیرہ میں خوشبودار پوڈر لگاتا تھا یا کوئی ایسی دوا استعمال کرتا تھا جس سے پسینے کی بُو دب جائے۔ لیکن حیرت ہے کہ اس نے کئی بار — ہاں کئی بار اس گھاٹن لڑکی کی بالوں بھری بغلوں کو چُوما اور اسے بالکل گھن نہ آئی۔ بلکہ عجیب طرح کی لذّت محسوس ہوئی۔ اس کی بغلوں کے نرم نرم بال پسینے کے باعث گیلے ہو رہے تھے۔ ان سے بھی وہی بو نکلتی تھی جو غائت درجہ قابلِ فہم ہونے کے

باوجود ناقابلِ فہم تھی۔ رندھیر کو ایسا لگتا تھا کہ وہ اس بو کو جانتا ہے۔ پہچانتا ہے اس کا مطلب بھی سمجھتا ہے۔ لیکن کسی اور کو سمجھا نہیں سکتا۔

برسات کے یہی دن تھے ۔ ۔ ۔ یہی، کھڑکی کے باہر جب اس نے دیکھا تھا تو پیپل کے پتّے لرز لرز کر نہا رہے تھے۔ ہوا میں سرسراہٹیں اور پھڑپھڑاہٹیں گھلی ہوئی تھیں۔ اندھیرا تھا مگر اس میں دبی دبی دھندلی سی روشنی بھی سموئی ہوئی تھی۔ جیسے بارش کے قطروں کے ساتھ لگ کر تاروں کی تھوڑی تھوڑی روشنی اُتر آئی ہے۔ برسات کے یہی دن تھے۔ جب رندھیر کے اس کمرے میں ساگوان کا صرف ایک پلنگ ہوتا تھا مگر اب اس کے ساتھ ہی ایک دوسرا بھی پڑا تھا اور کونے میں ایک نئی ڈریسنگ ٹیبل بھی موجود تھی۔ دن یہی برسات کے تھے۔ موسم بھی بالکل ایسا ہی تھا۔ بارش کے قطروں کے ساتھ تاروں کی تھوڑی تھوڑی روشنی بھی اُتر رہی تھی مگر فضا میں حنا کے عطر کی تیز خوشبو بسی ہوئی تھی۔

دوسرا پلنگ خالی تھا۔ اس پلنگ پر جس پر رندھیر اوندھے منہ لیٹا کھڑکی کے باہر پیپل کے لرزتے ہوئے پتوں پر بارش کے قطروں کا رقص دیکھ رہا تھا۔ ایک گوری چٹی لڑکی اپنے ستر کو ننگے جسم سے چھپانے کی ناکام کوشش کرتے کرتے غالباً سو گئی تھی ۔۔ اس کی لال ریشمی شلوار دوسرے پلنگ پر پڑی تھی۔ اس کے گہرے سُرخ آزار بند کا ایک پُھندنا نیچے لٹک رہا تھا۔ اس پلنگ پر اس کے دوسرے اترے ہوئے کپڑے بھی پڑے تھے۔ اس کی سنہرے پھولوں والی قمیص

انگیا، جانگیا اور دوپٹہ۔ سب کا رنگ سرخ تھا، بے حد سرخ، یہ سب کپڑے حنا کے عطر کی تیز خوشبو میں بسے ہوئے تھے۔

لڑکی کے سیاہ بالوں میں مقیش کے ذرے گرد کی طرح جمے ہوئے تھے۔ چہرے پر غازے، سرخی اور مقیش کے ان ذرات نے مل جل کر ایک عجیب و غریب رنگ پیدا کر دیا تھا۔ بے جان سا، اڑا اڑا اور اس کے گورے سینے پر انگیا کے کچے رنگ نے جا بجا لال لال دھبے ڈال دیئے تھے۔

چھاتیاں دودھ کی طرح سفید تھیں جس میں تھوڑی نیلاہٹ بھی ہوتی ہے۔ بغلوں کے بال منڈے ہوئے تھے جس کے باعث وہاں سرمئی غبار سا پیدا ہو گیا تھا۔ رندھیر کئی بار اس لڑکی کی طرف دیکھ کر سوچ چکا تھا۔ کیا ایسا نہیں لگتا۔ جیسے میں نے ابھی ابھی کیلیں اکھیڑ کر اسے لکڑی کے بند بکس میں سے نکالا ہے۔ کتابوں اور چینی کے برتنوں کی طرح کیونکہ جس طرح کتابوں پر دباؤ کے نشان ہوتے ہیں اور چینی کے برتنوں پر ہلنے جلنے سے خراشیں آجاتی ہیں ٹھیک اسی طرح اس لڑکی کے بدن پر کئی جگہ ایسے نشان تھے۔

جب رندھیر نے اس کی تنگ اور چست انگیا کی ڈوریاں کھولی تھیں تو پیٹھ پر اور سامنے سینے کے نرم نرم گوشت پر جھریاں سی بنی ہوئی تھیں اور کمر کے اردگرد کس کر بندھے ہوئے ازار بند کا نشان۔ وزنی اور نوکیلے جڑاؤ نکلیس سے اس کے سینے پر کئی جگہ خراشیں پیدا ہو گئی تھیں جیسے ناخنوں سے بڑے

زور کے ساتھ کھجایا گیا ہے۔ برسات کے وہی دن تھے۔ پیپل کی نرم نرم کومل پتّیوں پر بارش کے قطرے گرنے سے ویسی ہی آواز پیدا ہو رہی تھی جیسی کہ رندھیر اس روز تمام رات سنتا رہا۔ موسم بہت خوشگوار تھا۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ لیکن اس میں حنا کے عطر کی تیز خوشبو گھلی ہوئی تھی۔

رندھیر کے ہاتھ بہت دیر تک اس گوری چٹی لڑکی کے کچّے دودھ ایسے سفید سینے پر ہوائی لمس کی طرح پھرتے رہے۔ اس کی انگلیوں نے اس گورے گورے جسم میں کئی ارتعاش دوڑتے ہوئے محسوس کئے تھے۔ اس نرم نرم جسم کے کئی گوشوں میں اسے سمٹی ہوئی کپکپاہٹوں کا بھی پتہ چلا تھا۔ جب اس نے اپنا سینہ اس کے سینے کے ساتھ ملایا تو رندھیر کے جسم کے ہر مسام نے اس لڑکی کے چھڑے ہوئے تاروں کی آواز سنی ــــ لیکن وہ پکار کہاں تھی۔ وہ پکار جو اس نے گھاٹن لڑکی کے جسم کی بو میں سونگھی تھی ــــ وہ پکار جو دودھ کے پیاسے بچے کے رونے سے کہیں زیادہ قابل فہم تھی ــــ وہ پکار جو صوتی حدود سے نکل کر بے آواز ہو گئی تھی۔

رندھیر سلاخوں والی کھڑکی سے باہر دیکھ رہا تھا۔ اس کے بہت قریب پیپل کے پتے لرز رہے تھے۔ مگر وہ ان کی لرزشوں کے اس پار دور ــــ بہت دور دیکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ جہاں اسے مٹیلے بادلوں میں ایک عجیب قسم کی دھندلی روشنی گھلی ہوئی دکھائی دیتی تھی۔ جیسے اس گھاٹن لڑکی کے سینے میں

اسے نظر آئی تھی۔ ایسی روشنی جو راز کی بات کی طرح چھپی ہوئی مگر ظاہر تھی۔

رندھیر کے پہلو میں ایک گوری چٹی لڑکی جس کا جسم دودھ اور گھی ملے آٹے کی طرح ملائم تھا، لیٹی تھی ـــ اس کے سوئے ہوئے جسم سے حنا کے عطر کی خوشبو آرہی تھی۔ جواب تھکی تھکی معلوم ہوتی تھی۔ رندھیر کو یہ دم توڑتی اور حالتِ نزع کو پہنچی ہوئی خوشبو بہت ناگوار معلوم ہوئی۔ اس میں کچھ کھٹاس سی تھی۔ ایک عجیب قسم کی کھٹاس جس طرح بدہضمی کی ڈکاروں میں ہوتی ہے۔ اداس ـــ بے رنگ، بے کیف۔

رندھیر نے اپنے پہلو میں لیٹی ہوئی لڑکی کی طرف دیکھا جس طرح پھٹے ہوئے دودھ میں سفید سفید بے جان پھٹکیاں، بے رنگ پانی میں ساکن ہوتی ہیں۔ اسی طرح اس لڑکی کی نسوانیت اس کے وجود میں ٹھہری ہوئی تھی، سفید سفید دھبوں کی صورت میں . . . . اصل میں رندھیر کے دل و دماغ میں وہ بو بسی ہوئی تھی جو اس گھاٹن لڑکی کے جسم سے بغیر کسی بیرونی کوشش کے باہر نکل رہی تھی وہ بو جو حنا کے عطر سے کہیں زیادہ ہلکی پھلکی اور رس بھری تھی جس میں سونگھے جانے کا اضطراب نہیں تھا جو خود بخود ناک کے رستے داخل ہو کر اپنی صحیح منزل پر پہنچ گئی تھی۔

رندھیر نے آخری کوشش کرتے ہوئے اس لڑکی کے دودھیالے جسم پر ہاتھ پھیرا، مگر اسے کوئی کپکپاہٹ محسوس نہ ہوئی . . . . . اس کی نئی نویلی بیوی

جو فرسٹ کلاس مجسٹریٹ کی لڑکی تھی۔ جس نے بی۔ اے تک تعلیم پائی تھی اور اپنے کالج میں سینکڑوں لڑکوں کے دل کی دھڑکن تھی۔ رندھیر کی نبض تیز نہ کر سکی — وہ حنا کی مرتی ہوئی خوشبو میں اس بُو کی جستجو کرتا رہا جو برسات کے انہی دنوں میں جب کہ کھڑکی کے باہر پیپل کے پتے بارش میں نہا رہے تھے۔ اسے گھاٹن لڑکی کے میلے جسم سے آئی تھی۔

دھواں

وہ جب اسکول روانہ ہوا تو اس نے راستے میں ایک قصائی دیکھا جس
کے سر پر ایک بہت بڑا ٹوکرا تھا اس میں دو تازہ ذبح کئے ہوئے بکرے تھے
کھالیں اتری ہوئی تھیں اور ان کے ننگے گوشت میں سے دھواں اٹھ رہا تھا
جگہ جگہ پر یہ گوشت جس کو دیکھ کر مسعود کے ٹھنڈے گالوں پر گرمی کی لہریں سی
دوڑ جاتی تھیں۔ پھڑک رہا تھا جیسے کبھی کبھی اُس کی آنکھ پھڑکا کرتی تھی۔

سوا نو بجے ہوں گے مگر جھکے ہوئے خاکستری بادلوں کے باعث ایسا معلوم
ہوتا تھا کہ بہت سویرا ہے۔ سردی میں شدت نہیں تھی۔ لیکن راہ چلتے آدمیوں
کے منہ سے گرم گرم سماوار کی ٹونٹیوں کی طرح گاڑھا سفید دھواں نکل رہا تھا۔
ہر شے بوجھل دکھائی دیتی تھی جیسے بادلوں کے وزن کے نیچے دبی ہوئی ہے۔ موسم
کچھ ویسی ہی کیفیت کا حامل تھا جو ربڑ کے جوتے پہن کر چلنے سے پیدا ہوتی ہے۔
اس کے باوجود کہ بازار میں لوگوں کی آمد و رفت جاری تھی اور دکانوں میں

زندگی کے آثار پیدا ہو چکے تھے۔ آوازیں مدھم تھیں۔ جیسے سرگوشیاں ہو رہی ہیں چپکے چپکے، دھیرے دھیرے باتیں ہو رہی ہیں۔ ہولے ہولے لوگ قدم اٹھا رہے ہیں کہ زیادہ اونچی آواز پیدا نہ ہو۔

مسعود بغل میں بستہ دبائے اسکول جا رہا تھا۔ آج اس کی چال بھی سست تھی۔ جب اس نے بے کھال کے تازہ ذبح کئے ہوئے بکروں کے گوشت سے سفید سفید دھواں اٹھتا دیکھا تو اسے راحت محسوس ہوئی۔ اس دھوئیں نے اس کے ٹھنڈے گالوں پر گرم گرم لکیروں کا ایک جال سا بُن دیا۔ اس گرمی نے اسے راحت پہنچائی اور وہ سوچنے لگا کہ سردیوں میں ٹھنڈے یخ ہاتھوں پر بید کھانے کے بعد اگر یہ دھواں مل جایا کرے تو کتنا اچھا ہو۔

فضا میں اُجلا پن نہیں تھا۔ روشنی تھی مگر دھندلی۔ کہر کی ایک پتلی سی تہہ ہر شے پر چڑھی ہوئی تھی جس سے فضا میں گدلا پن پیدا ہو گیا تھا۔ یہ گدلا پن آنکھوں کو اچھا معلوم ہوتا تھا۔ اس لئے کہ نظر آنے والی چیزوں کی نوک پلک کچھ مدھم پڑ گئی تھی۔

مسعود جب اسکول پہنچا تو اسے اپنے ساتھیوں سے یہ معلوم کر کے قطعی طور پر خوشی نہ ہوئی کہ اسکول سکتر صاحب کی موت کے باعث بند کر دیا گیا ہے سب لڑکے خوش تھے۔ جس کا ثبوت یہ تھا کہ وہ اپنے بستے ایک جگہ پر رکھ کر اسکول کے صحن میں اوٹ پٹانگ کھیلوں میں مشغول تھے۔ کچھ چھٹی کا پتہ معلوم

کرتے ہی گھر چلے گئے۔ کچھ آ رہے تھے اور کچھ نوٹس بورڈ کے پاس جمع تھے اور بار بار ایک ہی عبارت پڑھ رہے تھے۔

مسعود نے جب سنا کہ سکتر صاحب مر گئے ہیں تو اسے بالکل افسوس نہ ہوا۔ اس کا دل جذبات سے بالکل خالی تھا۔ البتہ اس نے یہ ضرور سوچا کہ پچھلے برس جب اس کے دادا جان کا انتقال ان ہی دنوں میں ہوا تھا تو ان کا جنازہ لے جانے میں بڑی دقت ہوئی تھی۔ اس لئے کہ بارش شروع ہو گئی تھی۔ وہ بھی جنازے کے ساتھ گیا تھا اور قبرستان میں چکنی کیچڑ کے باعث ایسا پھسلا تھا کہ کھدی ہوئی قبر میں گرتے گرتے بچا تھا۔ یہ سب باتیں اس کو اچھی طرح یاد تھیں۔ سردی کی شدت، اس کے کیچڑ سے لت پت کپڑے سرخی مائل نیلے ہاتھ جن کو دبانے سے سفید سفید دھبے پڑ جاتے تھے۔ ناک جو کہ برف کی ڈلی معلوم ہوتی تھی اور پھر آ کر ہاتھ پاؤں دھونے اور کپڑے بدلنے کا مرحلہ — یہ سب کچھ اس کو اچھی طرح یاد تھا۔ چنانچہ جب اس نے سکتر صاحب کی موت کی خبر سنی تو اسے یہ سب بیتی ہوئی باتیں یاد آ گئیں اور اس نے سوچا جب سکتر صاحب کا جنازہ اٹھے گا تو بارش شروع ہو جائے گی اور قبرستان میں اتنی کیچڑ ہو جائے گی کہ کئی لوگ پھسلیں گے اور ان کو ایسی چوٹیں آئیں گی۔ کہ بلبلا اٹھیں گے۔

مسعود نے یہ خبر سن کر سیدھا اپنی کلاس کا رخ کیا۔ کمرے میں پہنچ کر اس نے

اپنے ڈسک کا تالا کھولا۔ دو تین کتابیں جو کہ اسے دوسرے روز پھر لانا تھیں اس میں رکھیں اور باقی بستہ اٹھا کر گھر کی جانب چل پڑا۔

رلستے میں اس نے پھر وہی دو تازہ ذبح کئے ہوئے بکرے دیکھے۔ ان میں سے ایک کو اب قصائی نے لٹکا دیا تھا۔ دوسرا تختے پر پڑا تھا جب مسعود دکان پر سے گذرا تو اس کے دل میں خواہش پیدا ہوئی کہ وہ گوشت کو جس میں سے دھواں اٹھ رہا تھا چھو کر دیکھے۔ چنانچہ اس نے آگے بڑھ کر انگلی سے بکرے کے اس حصے کو چھو کر دیکھا جو ابھی تک پھڑک رہا تھا۔ گوشت گرم تھا۔ مسعود کی ٹھنڈی انگلی کو یہ حرارت بہت بھلی معلوم ہوئی۔ قصائی دکان کے اندر چھریاں تیز کرنے میں مصروف تھا۔ چنانچہ مسعود نے ایک بار پھر گوشت کو چھو کر دیکھا اور وہاں سے چل پڑا۔

گھر پہنچ کر اس نے جب اپنی ماں کو سکتر صاحب کی موت کی خبر سنائی تو اسے معلوم ہوا کہ اس کے اباجی انہی کے جنازے کے ساتھ گئے ہیں۔ اب گھر میں صرف دو آدمی تھے۔ ماں اور بڑی بہن۔ ماں باورچی خانہ میں بیٹھی سالن پکا رہی تھی اور بڑی بہن کلثوم پاس ہی ایک کانگڑی لئے درباری کی سرگم یاد کر رہی تھی۔

چونکہ گلی کے دوسرے لڑکے گورمنٹ اسکول میں پڑھتے تھے۔ جس پر اسلامیہ اسکول کے سکتر کی موت کا کچھ اثر نہیں ہوا تھا۔ اس لئے مسعود نے خود کو بالکل بیکار محسوس کیا۔ اسکول کا کوئی کام بھی نہیں تھا چھٹی جماعت میں جو کچھ پڑھایا جاتا ہے۔

وہ گھر میں اپنے اباجی سے پڑھ چکا تھا۔ کھیلنے کے لئے بھی اُس کے پاس کوئی چیز نہ تھی۔ ایک میلا کچیلا تاش طاق میں پڑا تھا مگر اس سے مسعود کو کوئی دلچسپی نہ تھی۔ لوڈو اور اسی قسم کے دوسرے کھیل جو اس کی بڑی بہن اپنی سہیلیوں کے ساتھ ہر روز کھیلتی تھی اُس کی سمجھ سے بالاتر تھے۔ سمجھ سے بالاتر یوں تھے کہ مسعود نے کبھی ان کو سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کی تھی۔ اس کو فطرتاً ایسے کھیلوں سے کوئی لگاؤ نہیں تھا۔

بستہ اپنی جگہ پر رکھنے اور کوٹ اتارنے کے بعد وہ باورچی خانے میں اپنی ماں کے پاس بیٹھ گیا اور درباری کی سرگم سنتا رہا۔ جس میں کئی دفعہ سارے گاما آتا تھا۔ اس کی ماں پالک کاٹ رہی تھی۔ پالک کاٹنے کے بعد اس نے سبز سبز ٹوکوں کا گیلا گیلا ڈھیر اٹھا کر ہنڈیا میں ڈال دیا۔ تھوڑی دیر کے بعد جب پالک کو آنچ لگی تو اس میں سے سفید سفید دھواں اُٹھنے لگا۔ اس دھوئیں کو دیکھ کر مسعود کو بکرے کا گوشت یاد آگیا۔ چنانچہ اس نے اپنی ماں سے کہا: "امی جان، آج میں نے قصائی کی دکان پر دو بکرے دیکھے۔ کھال اتری ہوئی تھی اور ان میں سے دھواں نکل رہا تھا۔ بالکل ایسے ہی جیسا کہ صبح سویرے میرے منہ سے نکلا کرتا ہے۔"

"اچھا۔۔!" یہ کہہ کر اس کی ماں چولھے میں لکڑیوں کے کوئلے جھاڑنے لگی،

"ہاں اور میں نے گوشت کو اپنی اُنگلی سے چھو کر دیکھا تو وہ گرم تھا۔"

"اچھا۔۔!" یہ کہہ کر اس کی ماں نے وہ برتن اٹھایا۔ جس میں اس نے پالک کا

ساگ دھویا تھا اور باورچی خانے سے باہر چلی گئی

"اور یہ گوشت کئی جگہ پر پھڑکتا بھی تھا"

"اچھا۔" مسعود کی بڑی بہن نے درباری سرگم یاد کرنا چھوڑ دی اور اس کی طرف متوجہ ہوئی۔ "کیسے پھڑکتا تھا"

"یوں ۔ یوں" مسعود نے انگلیوں سے پھڑکن پیدا کر کے اپنی بہن کو دکھائی۔

"پھر کیا ہوا"

یہ سوال کلثوم نے اپنے سرگم بھرے دماغ سے کچھ اس طور پر نکالا کہ مسعود ایک لحظے کے لئے بالکل خالی الذہن ہو گیا۔ "پھر کیا ہونا تھا۔ میں نے ایسے ہی آپ سے بات کی تھی کہ قصائی کی دکان پر گوشت پھڑک رہا تھا۔ میں نے انگلی سے چھو کر بھی دیکھا تھا۔ گرم تھا۔"

"گرم تھا۔ . . . اچھا مسعود یہ بتاؤ تم میرا ایک کام کرو گے"

"بتائیے"

"آؤ، میرے ساتھ آؤ"

"نہیں آپ پہلے بتائیے ۔کام کیا ہے"

"تم آؤ تو سہی میرے ساتھ"

"جی نہیں ۔ آپ پہلے کام بتائیے"

"دیکھو میری کمر میں بڑا درد ہو رہا ہے ۔۔۔ میں پلنگ پر لیٹتی ہوں تم ذرا پاؤں سے دبا دینا ۔ اچھے بھائی جو ہوئے ۔ اللہ کی قسم بڑا درد ہو رہا ہے۔" یہ کہہ کر مسعود کی بہن نے اپنی کمر پر مکیاں مارنا شروع کر دیں۔

"یہ آپ کی کمر کو کیا ہو جاتا ہے ۔ جب دیکھو درد ہو رہا ہے ، اور پھر آپ دبواتی بھی مجھی سے ہیں ۔ کیوں نہیں اپنی سہیلیوں سے کہتیں۔" مسعود اٹھ کھڑا ہوا اور رضی ہو گیا۔

"چلئے ، لیکن آپ سے یہ کہے دیتا ہوں کہ دس منٹ سے زیادہ میں بالکل نہیں دباؤں گا۔"

"شاباش ۔ شاباش۔" اس کی بہن اٹھ کھڑی ہوئی اور سر گموں کی کاپی سامنے طاق میں رکھ کر اس کمرے کی طرف روانہ ہوئی ۔ جہاں وہ اور مسعود دونوں سوتے تھے ۔

صحن میں پہنچ کر اس نے اپنی دکھتی ہوئی کمر سیدھی کی اور اوپر آسمان کی طرف دیکھا ۔ مٹیالے بادل جھکے ہوئے تھے ۔ "مسعود ، آج ضرور بارش ہو گی۔" یہ کہہ کر اس نے مسعود کی طرف دیکھا مگر وہ اندر اپنی چارپائی پر لیٹا تھا ۔

جب کلثوم اپنے پلنگ پر اوندھے منہ لیٹ گئی تو مسعود نے اٹھ کر گھڑی میں وقت دیکھا ۔ "دیکھئے باجی گیارہ بجنے میں دس منٹ باقی ہیں ۔ میں پورے گیارہ بجے آپ کی کمر دابنا چھوڑ دوں گا۔"

"بہت اچھا ، لیکن تم اب خدا کے لئے زیادہ نخرے نہ بگھارو ۔ ادھر میرے

پلنگ پر آکر جلدی کمر دباؤ۔ ورنہ یاد رکھو۔ بڑے زور سے کان اینٹھوں گی۔" کلثوم نے مسعود کو ڈانٹ پلائی۔ مسعود نے اپنی بڑی بہن کے حکم کی تعمیل کی اور دیوار کا سہارا لے کر پاؤں سے اس کی کمر دبانا شروع کر دی۔ مسعود کے وزن کے نیچے کلثوم کی چوڑی چکلی کمر میں خفیف سا جھکاؤ پیدا ہو گیا۔ جب اس نے پیروں سے دبانا شروع کیا، ٹھیک اسی طرح جس طرح مزدور مٹی گوندھتے ہیں۔ تو کلثوم نے مزا لینے کی خاطر ہولے ہولے ہائے ہائے کرنا شروع کیا۔

کلثوم کے کولھوں پر گوشت زیادہ تھا۔ جب مسعود کا پاؤں اس حصے پر پڑا تو اسے ایسا محسوس ہوا کہ وہ اس بکرے کے گوشت کو دبا رہا ہے جو اس نے قصائی کی دکان میں اپنی انگلی سے چھو کر دیکھا تھا۔ اس احساس نے چند لمحات کے لئے اس کے دل و دماغ میں ایسے خیالات پیدا کئے۔ جن کا کوئی سر تھا نہ پیر۔ وہ ان کا مطلب نہ سمجھ سکا اور سمجھتا بھی کیسے جبکہ کوئی خیال مکمل ہی نہ تھا۔

ایک دو بار مسعود نے یہ بھی محسوس کیا کہ اس کے پیروں کے نیچے گوشت کے لوتھڑوں میں حرکت پیدا ہوئی ہے۔ اسی قسم کی حرکت جو اس نے بکرے کے گرم گرم گوشت میں دیکھی تھی۔ اس نے بڑی بددلی سے کمر دبانا شروع کی تھی۔ مگر اب اسے اس کام میں لذت محسوس ہونے لگی۔ اس کے وزن کے نیچے کلثوم ہولے ہولے کراہ رہی تھی۔ یہ بھنچی بھنچی آواز جو کہ مسعود کے پیروں کی حرکت کا ساتھ دے رہی تھی۔ اس گمنام سی لذت میں اضافہ کر رہی تھی۔

ٹائم پیس میں گیارہ بج گئے۔ مگر مسعود اپنی بہن کلثوم کی کمر دباتا رہا۔ جب کمر اچھی طرح دبائی جا چکی تو کلثوم سیدھی لیٹ گئی اور کہنے لگی: "شاباش مسعود، شاباش۔ لو اب لگے ہاتھوں ٹانگیں بھی دبا دو۔ بالکل اسی طرح ــ شاباش میرے بھائی۔"

مسعود نے دیوار کا سہارا لے کر کلثوم کی رانوں پر جب اپنا پورا وزن ڈالا تو اس کے پاؤں کے نیچے مچھلیاں سی تڑپ گئیں۔ بے اختیار وہ ہنس پڑی اور دوہری ہو گئی۔ مسعود گرتے گرتے بچا۔ لیکن اس کے تلووں میں مچھلیوں کی وہ تڑپ منجمد سی ہو گئی۔ اس کے دل میں زبردست خواہش پیدا ہوئی کہ وہ پھر اسی طرح دیوار کا سہارا لے کر اپنی بہن کی رانیں دبائے، چنانچہ اس نے کہا: "یہ آپ نے ہنسنا کیوں شروع کر دیا۔ سیدھی لیٹ جائیے۔ میں آپ کی ٹانگیں دبا دوں۔"

کلثوم سیدھی لیٹ گئی۔ رانوں کی مچھلیاں ادھر ادھر ہونے کے باعث جو گدگدی پیدا ہوئی تھی۔ اس کا اثر ابھی تک اس کے جسم میں باقی تھا: "نا بھائی میرے گدگدی ہوتی ہو۔ تم وحشیوں کی طرح دباتے ہو۔"

مسعود نے خیال کیا کہ شاید اس نے غلط طریقہ استعمال کیا ہے: "نہیں، اب کی دفعہ میں پورا بوجھ آپ پر نہیں ڈالوں گا ــ آپ اطمینان رکھئے۔ اب ایسی اچھی طرح دباؤں گا کہ آپ کو کوئی تکلیف نہ ہو گی۔"

دیوار کا سہارا لے کر مسعود نے اپنے جسم کو تولا اور اس انداز سے آہستہ

آہستہ کلثوم کی رانوں پر اپنے پیر جمائے کہ اس کا آدھا بوجھ کہیں غائب ہو گیا۔ ہولے ہولے بڑی ہوشیاری سے اس نے پیر چلانے شروع کیے۔ کلثوم کی رانوں میں اکڑی ہوئی مچھلیاں اس کے پیروں کے نیچے دب دب کر ادھر ادھر پھسلنے لگیں۔ مسعود نے ایک بار اسکول میں تنے ہوئے رسّے پر ایک بازیگر کو چلتے دیکھا تھا۔ اس نے سوچا کہ بازیگر کے پیروں کے نیچے تنا ہوا رسّا اسی طرح پھسلتا ہوگا۔

اس سے پہلے کئی بار اس نے اپنی بہن کلثوم کی ٹانگیں دبائی تھیں مگر وہ لذت جو کہ اسے اب محسوس ہو رہی تھی۔ پہلے کبھی محسوس نہیں ہوئی تھی۔ بکرے کے گرم گرم گوشت کا اسے بار بار خیال آتا تھا۔ ایک دو مرتبہ اس نے سوچا ،کلثوم کو اگر ذبح کیا جائے تو کھال اُتر جانے پر کیا اس کے گوشت میں سے بھی دھواں نکلے گا؟" لیکن ایسی بیہودہ باتیں سوچنے پر اس نے اپنے آپ کو مجرم محسوس کیا اور دماغ کو اس طرح صاف کر دیا جیسے وہ سلیٹ کو اسفنج سے صاف کیا کرتا تھا۔

"بس۔ بس۔" کلثوم تھک گئی۔ "بس بس۔"

مسعود کو ایک دم شرارت سوجھی۔ وہ پلنگ پر سے نیچے اُترنے لگا تو اس نے کلثوم کی دونوں بغلوں میں گدگدی شروع کر دی۔ ہنسی کے مارے وہ لوٹ پوٹ ہو گئی۔ اس میں اتنی سکت نہیں تھی کہ وہ مسعود کے ہاتھوں کو پرے جھٹک دے

لیکن جب اس نے ارادہ کر کے اس کے لات جمانی چاہی تو مسعود اچھل کر زد سے باہر ہو گیا اور سلیپر پہن کر کمرے سے نکل گیا۔

جب وہ صحن میں داخل ہوا تو اس نے دیکھا کہ ہلکی ہلکی بوندا باندی ہو رہی ہے بادل اور بھی جھک آئے تھے۔ پانی کے ننھے ننھے قطرے آواز پیدا کئے بغیر ان کی اینٹوں میں آہستہ آہستہ جذب ہو رہے تھے۔ مسعود کا جسم ایک دلنواز حرارت محسوس کر رہا تھا جب ہوا کا ٹھنڈا ٹھنڈا جھونکا اس کے گالوں کے ساتھ مس ہوا اور دو تین ننھی ننھی بوندیں اس کی ناک پر پڑیں تو ایک جھرجھری سی اس کے بدن میں لہرا اٹھی۔ سامنے کوٹھے کی دیوار پر ایک کبوتر اور ایک کبوتری پاس پاس پر پھلائے بیٹھے تھے، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ دونوں دم پخت کی ہوئی ہنڈیا کی طرح گرم ہیں۔ گل داؤدی اور ناز بو کے ہرے ہرے پتے اوپر لال لال گملوں میں نہا رہے تھے۔ فضا میں نیندیں گھلی ہوئی تھیں۔ ایسی نیندیں جن میں بیداری زیادہ ہوتی ہے اور انسان کے ارد گرد نرم نرم خواب یوں لپٹ جاتے ہیں جیسے اونی کپڑے۔

مسعود ایسی باتیں سوچنے لگا۔ جن کا مطلب اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ وہ ان باتوں کو چھو کر دیکھ سکتا تھا مگر ان کا مطلب اس کی گرفت سے باہر تھا پھر بھی ایک گمنام سا مزا اس سوچ بچار میں اسے آ رہا تھا۔

بارش میں کچھ دیر کھڑے رہنے کے باعث جب مسعود کے ہاتھ بالکل یخ ہو گئے

اور دبانے سے اُن پر سفید دھبے پڑنے لگے تو اُس نے مُٹھیاں کس لیں اور ان کو منہ کی بھاپ سے گرم کرنا شروع کیا۔ ہاتھوں کو اس عمل سے کچھ گرمی تو پہنچی۔ مگر وہ نم آلود ہو گئے۔ چنانچہ آگ تاپنے کے لیئے وہ باورچی خانے میں چلا گیا۔ کھانا تیار تھا۔ ابھی اس نے پہلا لقمہ ہی اٹھایا تھا کہ اس کا باپ قبرستان سے واپس آ گیا باپ بیٹے میں کوئی بات نہ ہوئی۔ مسعود کی ماں اٹھ کر فوراً دوسرے کمرے میں چلی گئی اور وہاں دیر تک اپنے خاوند کے ساتھ باتیں کرتی رہی

کھانے سے فارغ ہو کر مسعود بیٹھک میں چلا گیا اور کھڑکی کھول کر فرش پر لیٹ گیا۔ بارش کی وجہ سے سردی کی شدت بڑھ گئی تھی۔ کیونکہ اب ہوا بھی چل رہی تھی۔ مگر یہ سردی ناخوشگوار معلوم نہیں ہوتی تھی۔ تالاب کے پانی کی طرح یہ اوپر ٹھنڈی اور اندر گرم تھی۔ مسعود جب فرش پر لیٹا تو اس کے دل میں خواہش پیدا ہوئی کہ وہ اس سردی کے اندر دھنس جائے۔ جہاں اس کے جسم کو راحت انگیز گرمی پہونچے۔ دیر تک وہ ایسی ہی گرم باتوں کے متعلق سوچتا رہا جس کے باعث اس کے پٹھوں میں ہلکی ہلکی دکھن پیدا ہو گئی۔ ایک دو بار اس نے انگڑائی لی تو اسے مزا آیا۔ اس کے جسم کے کسی حصے میں، یہ اس کو معلوم نہیں تھا کہ کہاں، کوئی چیز اٹک سی گئی تھی۔ یہ چیز کیا تھی۔ اس کے متعلق بھی مسعود کو علم نہیں تھا البتہ اس اٹکاؤ نے اس کے سارے جسم میں اضطراب ایک دبے ہوئے اضطراب کی کیفیت پیدا کر دی تھی۔ اس کا سارا جسم کھنچ کر لمبا ہو جانے کا ارادہ بن گیا تھا۔

دیر تک گدگدے قالین پر کروٹیں بدلنے کے بعد وہ اٹھا اور باورچی خانے سے ہوتا ہوا صحن میں آنکلا۔ کوئی باورچی خانے میں تھا نہ صحن میں۔ ادھر ادھر جتنے کمرے تھے سب کے سب بند تھے۔ بارش اب رک گئی تھی۔ مسعود نے ہاکی اور گیند نکالی اور صحن میں کھیلنا شروع کر دیا۔ ایک بار جب اس نے زور سے ہٹ لگائی تو گیند صحن کے دائیں ہاتھ والے کمرے کے دروازے پر لگی۔ اندر سے مسعود کے باپ کی آواز آئی: "کون ؟"

"جی میں ہوں مسعود!"

اندر سے آواز آئی: "کیا کر رہے ہو؟"

"جی کھیل رہا ہوں۔"

"کھیلو۔ ۔ ۔" پھر تھوڑے سے توقف کے بعد اس کے باپ نے کہا: "تمہاری ماں میرا سر دبا رہی ہے ۔۔۔ زیادہ شور نہ مچانا۔"

یہ سن کر مسعود نے گیند وہیں پڑی رہنے دی اور ہاکی ہاتھ میں لئے سامنے والے کمرے کا رخ کیا۔ اس کا ایک دروازہ بند تھا اور دوسرا نیم باز ۔۔۔ مسعود کو ایک شرارت سوجھی۔ دبے پاؤں وہ نیم باز دروازے کی طرف بڑھا اور دھماکے کے ساتھ دونوں پٹ کھول دیئے۔ دو چیخیں بلند ہوئیں اور کلثوم اور اس کی سہیلی بملا نے جو کہ پاس پاس لیٹی تھیں۔ خوفزدہ ہو کر جھٹ سے لحاف اوڑھ لیا۔

بملا کے بلاؤز کے بٹن کھلے ہوئے تھے اور کلثوم اس کے عریاں سینے کو

گھور رہی تھی۔

x x x x

مسعود کچھ سمجھ نہ سکا۔ اس کے دماغ پر دھواں سا چھا گیا۔ وہاں سے الٹے قدم لوٹ کر وہ جب بیٹھک کی طرف روانہ ہوا تو اسے معاً اپنے اندر ایک اتھاہ طاقت کا احساس ہوا جس نے کچھ دیر کے لئے اس کی سوچنے سمجھنے کی قوت بالکل کمزور کر دی۔

بیٹھک میں کھڑکی کے پاس بیٹھ کر جب مسعود نے ہاکی کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر گھٹنے پر رکھا تو یہ سوچا کہ ہلکا سا دباؤ ڈالنے پر بھی ہاکی میں خم پیدا ہو جائے گا اور زیادہ زور لگانے پر تو ہینڈل چٹاخ سے ٹوٹ جائے گا۔ اس نے گھٹنے پر ہاکی کے ہینڈل میں خم تو پیدا کر لیا مگر زیادہ سے زیادہ زور لگانے پر بھی وہ ٹوٹ نہ سکا۔ دیر تک وہ ہاکی کے ساتھ کشتی لڑتا رہا۔ جب تھک کر ہار گیا تو جھنجلا کر اس نے ہاکی پرے پھینک دی۔

کالی شلوار

دہلی آنے سے پہلے وہ انبالہ چھاؤنی میں تھی۔ جہاں کئی گورے اس کے گاہک تھے۔ ان گوروں سے ملنے جلنے کے باعث وہ انگریزی کے دس پندرہ جملے سیکھ گئی تھی۔ ان کو وہ عام گفتگو میں استعمال نہیں کرتی تھی۔ لیکن جب وہ دہلی میں آئی اور اس کا کاروبار نہ چلا تو ایک دن اس نے اپنی پڑوسن طمنچہ جان سے کہا۔ "دِس لیف ___ ویری بیڈ۔" یعنی یہ زندگی بہت بری ہے۔ جبکہ کھانے ہی کو نہیں ملتا۔"

انبالہ چھاؤنی میں اس کا دھندا بہت اچھی طرح چلتا تھا۔ چھاؤنی کے گورے شراب پی کر اس کے پاس آجاتے تھے اور وہ تین چار گھنٹوں ہی میں آٹھ دس گوروں کو نمٹا کر بیس تیس روپے پیدا کر لیا کرتی تھی۔ یہ گورے اس کے ہم وطنوں کے مقابلے میں بہت اچھے تھے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ ایسی زبان بولتے تھے جس کا مطلب سلطانہ کی سمجھ میں نہیں آتا تھا مگر ان کی زبان سے یہ لاعلمی اس کے حق میں بہت اچھی ثابت ہوتی تھی۔ اگر وہ اس سے کچھ رعایت چاہتے۔ تو وہ

سر ہلا کر کہہ دیا کرتی تھی: "صاحب، ہماری سمجھ میں تمہاری بات نہیں آتا۔" اور اگر وہ اس سے ضرورت سے زیادہ چھیڑ چھاڑ کرتے تو وہ ان کو اپنی زبان میں گالیاں دینا شروع کر دیتی تھی۔ وہ حیرت میں اس کے منہ کی طرف دیکھتے تو وہ ان سے کہتی "صاحب تم ایک دم الّو کا پٹھا ہے۔ حرامزادہ ہے ــ سمجھا۔" یہ کہتے وقت وہ اپنے لہجے میں سختی پیدا نہ کرتی۔ بلکہ بڑے پیار کے ساتھ ان سے باتیں کرتی ــ گورے ہنس دیتے اور ہنستے وقت وہ سلطانہ کو بالکل الّو کے پٹھے دکھائی دیتے۔

مگر یہاں دہلی میں وہ جب سے آئی تھی۔ ایک گورا بھی اس کے یہاں نہیں آیا تھا۔ تین مہینے اُس کو ہندوستان کے اس شہر میں رہتے ہو گئے تھے۔ جہاں اس نے سنا تھا کہ بڑے لاٹ صاحب رہتے ہیں۔ جو گرمیوں میں شملے چلے جاتے ہیں۔ صرف چھ آدمی اس کے پاس آئے تھے۔ صرف چھ، یعنی مہینے میں دو۔ اور ان چھ گاہکوں سے اس نے خدا جھوٹ نہ بلوائے تو ساڑھے اٹھارہ روپے وصول کئے تھے۔ تین روپے سے زیادہ پر کوئی مانتا ہی نہیں تھا۔ سلطانہ نے ان میں سے پانچ آدمیوں کو اپنا ریٹ دس روپے بتایا تھا۔ مگر تعجب کی بات ہے کہ اُن میں سے ہر ایک نے یہی کہا: "بھئی ہم تین روپے سے زیادہ ایک کوڑی نہیں دیں گے۔" جانے کیا بات تھی کہ ان میں سے ہر ایک نے اسے صرف تین روپے کے قابل سمجھا۔ چنانچہ جب چھٹا آیا تو اس نے خود اس سے کہا: "دیکھو، میں تین روپے ایک ٹیم کے لوں گی۔ اس سے ایک ادھیلا تم کم کہو تو نہ ہو گا۔ اب تمہاری مرضی

ہو تو رہو ورنہ جاؤ۔" چھٹے آدمی نے یہ بات سن کر تکرار نہ کی اور اس کے ہاں ٹھہر گیا۔ جب دوسرے کمرے میں دروازے بند کر کے وہ اپنا کوٹ اتارنے لگا تو سلطانہ نے کہا۔" لائیے ایک روپیہ دودھ کا۔" اس نے ایک روپیہ تو نہ دیا لیکن نئے بادشاہ کی چمکتی ہوئی اٹھنی جیب میں سے نکال کر اس کو دے دی اور سلطانہ نے بھی چپکے سے لے لی کہ چلو جو آیا ہے غنیمت ہے۔

ساڑھے اٹھارہ روپے تین مہینوں میں ــ بیس روپے ماہوار تو اس کوٹھے کا کرایہ تھا جس کو مالک مکان انگریزی زبان میں فلیٹ کہتا تھا۔ اس فلیٹ میں ایسا پاخانہ تھا جس میں زنجیر کھینچنے سے ساری گندگی پانی کے زور سے ایک دم نیچے نل میں غائب ہو جاتی تھی اور بڑا شور ہوتا تھا۔ شروع شروع میں تو اس شور نے اسے بہت ڈرایا تھا۔ پہلے دن جب وہ رفع حاجت کے لئے اس پاخانے میں گئی تو اس کی کمر میں شدت کا درد ہو رہا تھا۔ فارغ ہو کر جب اٹھنے لگی تو اس نے لٹکی ہوئی زنجیر کا سہارا لے لیا۔ اس زنجیر کو دیکھ کر اس نے خیال کیا چونکہ یہ مکان خاص ہم لوگوں کی رہائش کے لئے تیار کئے گئے ہیں، یہ زنجیر اسی لئے لگائی گئی ہے کہ اٹھتے وقت تکلیف نہ ہو اور سہارا مل جایا کرے مگر جونہی اس نے زنجیر کو پکڑ کر اٹھنا چاہا۔ اوپر کھٹ کھٹ سی ہوئی اور پھر ایک دم پانی اس شور کے ساتھ باہر نکلا کہ ڈر کے مارے اس کے منہ سے چیخ نکل گئی

خدا بخش دوسرے کمرے میں اپنا فوٹو گرافی کا سامان درست کر رہا تھا اور

ایک صاف بوتل میں ہائی ڈرو کونین ڈال رہا تھا کہ اس نے سلطانہ کی چیخ سُنی۔ دوڑ کر وہ باہر نکلا اور سلطانہ سے پوچھا "کیا ہوا؟ ۔۔۔ یہ چیخ تمہاری تھی"

سلطانہ کا دل دھڑک رہا تھا۔ اس نے کہا "یہ موا بیچانہ ہے یا کیا ہے بیچ میں یہ ریل گاڑیوں کی طرح زنجیر کیا لٹکا رکھی ہے۔ میری کمر میں درد تھا میں نے کہا چلو اس کا سہارا لے لوں گی، پر اس موئی زنجیر کو چھیڑنا تھا کہ وہ دھماکا ہوا کہ میں تم سے کیا کہوں۔"

اس پر خدا بخش بہت ہنسا تھا اور اس نے سلطانہ کو اس بیچانے کی بابت سب کچھ بتا دیا تھا کہ یہ نئے فیشن کا ہے جس میں زنجیر ہلانے سے سب گندگی نیچے زمین میں دھنس جاتی ہے۔

خدا بخش اور سلطانہ کا آپس میں کیسے سمبندھ ہوا یہ ایک لمبی کہانی ہے۔ خدا بخش راولپنڈی کا تھا۔ انٹرنس پاس کرنے کے بعد اس نے لاری چلانا سیکھی چنانچہ چار برس تک وہ راولپنڈی اور کشمیر کے درمیان لاری چلانے کا کام کرتا رہا۔ اس کے بعد کشمیر میں اُس کی دوستی ایک عورت سے ہو گئی۔ اس کو بھگا کر وہ ساتھ لے آیا۔ لاہور میں چونکہ اس کو کوئی کام نہ ملا۔ اس لئے اس نے عورت کو پیشے بٹھا دیا۔ دو تین برس تک یہ سلسلہ جاری رہا اور وہ عورت کسی اور کے ساتھ بھاگ گئی۔ خدا بخش کو معلوم ہوا کہ وہ انبالہ میں ہے۔ وہ اس کی تلاش میں آیا۔ جہاں اس کو سلطانہ مل گئی۔ سلطانہ نے اس کو پسند کیا۔ چنانچہ

دونوں کا سمبندھ ہو گیا۔

خدا بخش کے آنے سے ایک دم سلطانہ کا کاروبار چمک اٹھا عورت چونکہ ضعیف الاعتقاد تھی۔ اس لیئے اس نے سمجھا کہ خدا بخش بڑا بھاگوان ہے جس کے آنے سے اتنی ترقی ہو گئی۔ چنانچہ اس خوش اعتقادی نے خدا بخش کی وقعت اس کی نظروں میں اور بھی بڑھا دی۔

خدا بخش آدمی محنتی تھا۔ سارا دن ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھنا پسند نہیں کرتا تھا چنانچہ اس نے ایک فوٹو گرافر سے۔ دوستی پیدا کی جو ریلوے اسٹیشن کے باہر منٹ کیمرے سے فوٹو کھینچا کرتا تھا۔ اس سے اس نے فوٹو کھینچنا سیکھا پھر سلطانہ سے ساٹھ روپے لے کر کیمرہ بھی خرید لیا۔ آہستہ آہستہ ایک پردہ بنوایا دو کرسیاں خریدیں اور فوٹو دھونے کا سب سامان لے کر اس نے علیحدہ اپنا اپنا کام شروع کر دیا۔

کام چل نکلا۔ چنانچہ اس نے تھوڑی ہی دیر کے بعد اپنا اڈا انبالے چھاؤنی میں قائم کر دیا۔ یہاں وہ گوروں کے فوٹو کھینچتا۔ ایک مہینے کے اندر اندر اس کی چھاؤنی کے متعدد گوروں سے واقفیت ہو گئی۔ چنانچہ وہ سلطانہ کو وہیں لے گیا۔ یہاں چھاؤنی میں خدا بخش کے ذریعہ سے کئی گورے سلطانہ کے مستقل گاہک بن گئے۔

سلطانہ نے کانوں کے لئے بُندے خریدے، ساڑھے پانچ تولے کی آٹھ کنگیاں بھی بنوائیں۔ دس پندرہ اچھی اچھی ساڑھیاں بھی جمع کر لیں۔ گھر میں فرنیچر وغیرہ بھی آ گیا۔ قصہ مختصر یہ کہ انبالہ چھاؤنی میں وہ بڑی خوش حال تھی مگر ایکا ایکی جانے خدا بخش کے دل میں کیا سمائی کہ اس نے دہلی جانے کی ٹھان لی۔ سلطانہ انکار کیسے کرتی جبکہ خدا بخش کو اپنے لئے بہت مبارک خیال کرتی تھی۔ اس نے خوشی خوشی دہلی جانا قبول کر لیا۔ بلکہ اس نے یہ بھی سوچا کہ اتنے بڑے شہر میں جہاں لاٹ صاحب رہتے ہیں۔ اس کا دھندا اور بھی اچھا چلے گا۔ اپنی سہیلیوں سے وہ دہلی کی تعریف سن چکی تھی۔ پھر وہاں حضرت نظام الدین اولیا کی خانقاہ تھی۔ جس سے اسے بے حد عقیدت تھی۔ چنانچہ جلدی جلدی گھر کا بھاری سامان بیچ باچ کر وہ خدا بخش کے ساتھ دہلی آ گئی۔ یہاں پہونچ کر خدا بخش نے بیس روپے ماہوار پر یہ فلیٹ لیا۔ جس میں دونوں رہنے لگے۔

ایک ہی قسم کے نئے مکانوں کی لمبی سی قطار سڑک کے ساتھ ساتھ چلی گئی ہے۔ میونسپل کمیٹی نے شہر کا یہ حصہ خاص کسبیوں کے لئے مقرر کر دیا تھا تاکہ وہ شہر میں جگہ جگہ اپنے اڈے نہ بنائیں۔ نیچے دوکانیں تھیں اور اوپر دو منزلہ رہائشی فلیٹ۔ چونکہ سب عمارتیں ایک ہی ڈیزائن کی ہیں۔ اس لئے شروع شروع میں سلطانہ کو اپنا فلیٹ تیار کرنے میں بہت دقت محسوس ہوئی تھی۔ پر جب نیچے لانڈری والے نے اپنا بورڈ گھر کی پیشانی پر لگا دیا تو اس کو ایک پکی نشانی

مل گئی: "یہاں میلے کپڑوں کی دھلائی کی جاتی ہے"۔ یہ بورڈ پڑھتے ہی وہ اپنا فلیٹ تلاش کر لیا کرتی تھی۔ اسی طرح اس نے اور بہت سی نشانیاں قائم کر لی تھیں۔ مثلاً بڑے بڑے حروف میں جہاں "کوئلوں کی دکان" لکھا تھا۔ وہاں اس کی سہیلی ہیرا بائی رہتی تھی جو کبھی کبھی ریڈیو گھر میں گانے جایا کرتی تھی۔ جہاں "شرفا کے کھانے کا اعلیٰ انتظام ہے" لکھا تھا وہاں اس کی دوسری سہیلی مختار رہتی تھی۔ نواڑ کے کارخانہ کے اوپر انوری رہتی تھی جو اسی کارخانے کے سیٹھ کے پاس ملازم تھی۔ چونکہ سیٹھ صاحب کو رات کے وقت اپنے کارخانے کی دیکھ بھال کرنا ہوتی تھی اس لئے وہ انوری کے پاس ہی رہتے تھے۔

دکان کھولتے ہی گاہک تھوڑے ہی آتے ہیں۔ چنانچہ جب ایک مہینے تک سلطانہ بیکار رہی تو اس نے یہی سوچ کر اپنے دل کو تسلی دی۔ پر جب دو مہینے گذر گئے اور کوئی آدمی اس کے کوٹھے پر نہ آیا تو اسے بہت تشویش ہوئی۔ اس نے خدا بخش سے کہا "کیا بات ہے خدا بخش۔ پورے دو مہینے ہو گئے ہیں ہمیں یہاں آئے ہوئے، کسی نے ادھر کا رخ بھی نہیں کیا۔ مانتی ہوں آج کل بازار بہت مندا ہے، پر اتنا مندا بھی تو نہیں کہ مہینے بھر میں کوئی شکل دیکھنے ہی میں نہ آئے"۔ خدا بخش کو بھی یہ بات بہت عرصہ سے کھٹک رہی تھی مگر وہ خاموش تھا پر جب سلطانہ نے خود بات چھیڑی تو اس نے کہا "میں کئی دنوں سے اس کی بابت سوچ رہا ہوں۔ ایک بات سمجھ میں آتی ہے، وہ یہ کہ جنگ کی وجہ سے

لوگ ہاگ دوسرے دھندوں میں پڑکر ادھر کا رستہ بھول گئے ہیں ۔۔ یا پھر یہ یہ ہو سکتا ہے کہ ۔ ۔ ۔ " وہ اس کے آگے کچھ کہنے ہی والا تھا کہ سیڑھیوں پر کسی کے چڑھنے کی آواز آئی ۔ خدا بخش اور سلطانہ دونوں اس آواز کی طرف متوجہ ہوئے ۔ تھوڑی دیر کے بعد دستک ہوئی ۔ خدا بخش نے لپک کر دروازہ کھولا ۔ ایک آدمی اندر داخل ہوا ۔ یہ پہلا گاہک تھا جس سے تین روپے میں سودا طے ہوا ۔ اس کے بعد پانچ اور آئے ، یعنی تین مہینے میں چھ ، جن سے سلطانہ نے صرف ساڑھے اٹھارہ روپے وصول کئے ۔

بیس روپے ماہوار تو فلیٹ کے کرایہ میں چلے جاتے تھے ۔ پانی کا ٹیکس اور بجلی کا بل جدا ۔ اس کے علاوہ گھر کے دوسرے خرچ ۔ کھانا پینا ، کپڑے لتے دوا دارو اور آمدن کچھ بھی نہیں تھی ۔ ساڑھے اٹھارہ روپے تین مہینے میں آئے تو اسے آمدن تو نہیں کہہ سکتے ۔ سلطانہ پریشان ہو گئی ۔ ساڑھے پانچ تولے کی آٹھ کنگنیاں جو اس نے انبالے میں بنوائی تھیں ، آہستہ آہستہ بک گئیں ۔ آخری کنگنی کی جب باری آئی تو اس نے خدا بخش سے کہا " تم میری سنو اور چلو واپس انبالے ۔۔۔ یہاں کیا دھرا ہے ؟ ۔۔۔ بھئی ہو گا ، پر ہمیں تو یہ شہر راس نہیں آیا ۔ تمہارا کام بھی وہاں خوب چلتا تھا ، چلو ، وہیں چلتے ہیں ۔ جو نقصان ہوا ہے اس کو اپنا سر صدقہ سمجھو ۔ اس کنگنی کو بیچ کر آؤ ۔ میں اسباب وغیرہ باندھ کر تیار رکھتی ہوں آج رات کی گاڑی سے یہاں سے چل دیں گے ۔ "

خدا بخش نے کنگنی سلطانہ کے ہاتھ سے لے لی اور کہا۔ "نہیں جانِ من! انبالے نہیں جائیں گے۔ یہیں دہلی میں رہ کر کمائیں گے۔ یہ تمہاری چوڑیاں سب کی سب یہیں واپس آئیں گی۔ اللہ پر بھروسہ رکھو۔ وہ بڑا کارساز ہے۔ یہاں بھی وہ کوئی نہ کوئی اسباب بنا ہی دے گا۔"

سلطانہ چپ ہو رہی۔ چنانچہ آخری کنگنی بھی ہاتھ سے اتر گئی۔ ننگے ہاتھ دیکھ کر اس کو بہت دکھ ہوتا تھا۔ پر کیا کرتی۔ پیٹ بھی تو آخر کسی حیلے سے بھرنا تھا۔

جب پانچ مہینے گذر گئے اور آمدن خرچ کے مقابلے میں چوتھائی سے بھی کچھ کم رہی تو سلطانہ کی پریشانی اور زیادہ بڑھ گئی۔ خدا بخش بھی سارا دن اب گھر سے غائب رہنے لگا تھا۔ سلطانہ کو اس کا بھی دکھ تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ پڑوس میں اس کی دو تین ملنے والیاں موجود تھیں۔ جن کے ساتھ وہ اپنا وقت کاٹ سکتی تھی۔ پر ہر روز ان کے یہاں جانا اور گھنٹوں بیٹھے رہنا اس کو بہت برا لگتا تھا۔ چنانچہ آہستہ آہستہ اس نے ان سہیلیوں سے ملنا جلنا بالکل ترک کر دیا۔ سارا دن وہ اپنے سنسان مکان میں بیٹھی رہتی۔ کبھی چھالیا کاٹتی رہتی۔ کبھی اپنے پرانے اور پھٹے ہوئے کپڑوں کو سیتی رہتی اور کبھی باہر بالکنی میں آکر جنگلے کے ساتھ لگ کر کھڑی ہو جاتی اور سامنے ریلوے شیڈ میں ساکت اور متحرک انجنوں کی طرف گھنٹوں بے مطلب دیکھتی رہتی۔

سڑک کی دوسری طرف مال گودام تھا جو اس کونے سے اس کونے تک

پھیلا ہوا تھا۔ داہنے ہاتھ کو لوہے کی چھت کے نیچے بڑی بڑی گانٹھیں پڑی رہتی تھیں اور ہر قسم کے مال واسباب کے ڈھیر سے لگے رہتے تھے۔ بائیں ہاتھ کو کھلا میدان تھا جس میں بے شمار ریل کی پٹڑیاں بچھی ہوئی تھیں۔ دھوپ میں لوہے کی یہ پٹڑیاں چمکتیں تو سلطانہ اپنے ہاتھوں کی طرف دیکھتی جن پر نیلی نیلی رگیں بالکل ان پٹڑیوں کی طرح ابھری رہتی تھیں۔ اس لمبے اور کھلے میدان میں ہر وقت انجن اور گاڑیاں چلتی رہتیں۔ کبھی ادھر کبھی ادھر۔ ان انجنوں اور گاڑیوں کی چھک چھک پھک پھک سدا گونجتی رہتی تھی۔ صبح سویرے جب وہ اٹھ کر بالکنی میں آتی تو ایک عجیب سماں نظر آتا۔ دھندلکے میں انجنوں کے منہ سے گاڑھا گاڑھا دھواں نکلتا اور گدلے آسمان کی جانب موٹے اور بھاری آدمیوں کی طرح اٹھتا دکھائی دیتا تھا۔ بھاپ کے بڑے بڑے بادل بھی ایک شور کے ساتھ پٹڑیوں سے اٹھتے اور آنکھ جھپکنے کی دیر میں ہوا کے اندر گھل مل جاتے تھے۔ پھر کبھی کبھی جب وہ گاڑی کے کسی ڈبے کو جسے انجن نے دھکا دے کر چھوڑ دیا ہو اکیلے پٹڑیوں پر چلتا دیکھتی تو اسے اپنا خیال آتا۔ وہ سوچتی کہ اسے بھی کسی نے زندگی کی پٹڑی پر دھکا دے کر چھوڑ دیا ہے اور وہ خود بخود جا رہی ہے۔ دوسرے لوگ کانٹے بدل رہے ہیں اور وہ چلی جا رہی ہے — نہ جانے کہاں۔ پھر ایک روز ایسا آئے گا۔ جب اس دھکے کا زور آہستہ آہستہ ختم ہو گا اور وہ کہیں رک جائے گی۔ کسی ایسے مقام پر جو اس کا دیکھا بھالا نہ ہو گا

یوں تو وہ بے مطلب گھنٹوں ریل کی ان ٹیڑھی بانکی پٹڑیوں اور ٹھیرے اور چلتے ہوئے انجنوں کی طرف دیکھتی رہی۔ پر طرح طرح کے خیال اس کے دماغ میں آتے رہتے تھے۔ انبالہ چھاؤنی میں جب وہ رہتی تھی تو اسٹیشن کے پاس ہی اس کا مکان تھا۔ مگر وہاں اس نے کبھی ان چیزوں کو ایسی نظروں سے نہیں دیکھا تھا۔ اب تو کبھی کبھی اس کے دماغ میں یہ بھی خیال آتا کہ یہ جو سامنے ریل کی پٹڑیوں کا جال سا بچھا ہے اور جگہ جگہ سے بھاپ اور دھواں اٹھ رہا ہے ایک بہت بڑا چکلہ ہے۔ بہت سی گاڑیاں ہیں۔ جن کو چند موٹے موٹے انجن ادھر ادھر دھکیلتے رہتے ہیں۔ سلطانہ کو تو بعض اوقات یہ انجن سیٹھ معلوم ہوتے۔ جو کبھی کبھی انبالہ میں اس کے ہاں آیا کرتے تھے۔ پھر کبھی کبھی جب وہ کسی انجن کو آہستہ آہستہ گاڑیوں کی قطار کے پاس سے گذرتا دیکھتی تو اسے ایسا محسوس ہوتا کہ کوئی آدمی چکلے کے کسی بازار میں سے اوپر کوٹھوں کی طرف دیکھتا جا رہا ہے۔

سلطانہ سمجھتی تھی کہ ایسی باتیں سوچنا دماغ کی خرابی کا باعث ہے چنانچہ جب اس قسم کے خیال اس کو آنے لگے تو اس نے بالکنی میں جانا چھوڑ دیا۔ خدا بخش سے اس نے بارہا کہا۔ "دیکھو، میرے حال پر رحم کرو۔ یہاں گھر میں رہا کرو۔ میں سارا دن یہاں بیماروں کی طرح پڑی رہتی ہوں۔" مگر اس نے ہر بار سلطانہ سے یہ کہہ کر اس کی تشفی کر دی۔ "جانِ من۔ میں باہر کچھ کمانے کی فکر کر رہا ہوں۔ اللہ نے چاہا تو چند دنوں ہی میں بیڑا پار ہو جائے گا۔"

پورے پانچ مہینے ہو گئے تھے مگر ابھی تک سلطانہ کا بیڑا پار ہوا تھا نہ خدا بخش کا۔ محرم کا مہینہ سر پر آ رہا تھا مگر سلطانہ کے پاس کالے کپڑے بنوانے کے لئے کچھ بھی نہ تھا۔ مختار نے لیڈی ہیملٹن کی ایک نئی وضع کی قمیص بنوائی تھی جس کی آستینیں کالی جارجٹ کی تھیں۔ اس کے ساتھ میچ کرنے کے لئے اس کے پاس کالی ساٹن کی شلوار تھی جو کاجل کی طرح چمکتی تھی۔ انوری نے ریشمی جارجٹ کی ایک بڑی نفیس ساڑھی خریدی تھی۔ اس نے سلطانہ سے کہا تھا کہ وہ اس ساڑھی کے نیچے سفید بوسکی کا پیٹی کوٹ پہنے گی۔ کیونکہ یہ نیا فیشن ہے۔ اس ساڑھی کے ساتھ پہننے کو انوری کالی مخمل کا ایک جوتا لائی تھی جو بڑا نازک تھا۔ سلطانہ نے جب یہ تمام چیزیں دیکھیں تو اس کو اس احساس نے بہت دکھ دیا کہ وہ محرم منانے کے لئے ایسا لباس خریدنے کی استطاعت نہیں رکھتی۔

انوری اور مختار کے پاس یہ لباس دیکھ کر جب وہ گھر آئی تو اس کا دل بہت مغموم تھا۔ اسے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ایک پھوڑا سا اس کے اندر پیدا ہو گیا ہے۔ گھر بالکل خالی تھا۔ خدا بخش حسب معمول باہر تھا۔ دیر تک وہ دری پر گاؤ تکیہ سر کے نیچے رکھ کر لیٹی رہی۔ پر جب اس کی گردن اونچائی کے باعث اکڑ سی گئی تو باہر بالکنی میں چلی گئی تاکہ غم افزا خیالات کو اپنے دماغ میں سے نکال دے۔

سامنے پٹڑیوں پہ گاڑیوں کے ڈبے کھڑے تھے پر انجن کوئی بھی نہ تھا۔ شام کا وقت تھا — چھڑکاؤ ہو چکا تھا۔ اس لئے گرد و غبار دب گیا تھا۔ بازار میں

ایسے آدمی چلنے شروع ہو گئے تھے جو تاک جھانک کرنے کے بعد چپ چاپ گھروں کا رخ کرتے ہیں۔ ایسے ہی ایک آدمی نے گردن اونچی کرکے سلطانہ کی طرف دیکھا سلطانہ مسکرا دی اور اس کو بھول گئی۔ کیونکہ اب سامنے پٹڑیوں پر ایک انجن نمودار ہو گیا تھا۔ سلطانہ نے غور سے اس کی طرف دیکھنا شروع کیا اور آہستہ آہستہ یہ خیال اس کے دماغ میں آیا کہ انجن نے بھی کالا لباس پہن رکھا ہے۔ یہ عجیب و غریب خیال دماغ میں سے نکالنے کی خاطر جب اس نے سڑک کی جانب دیکھا تو اُسے وہی آدمی بیل گاڑی کے پاس کھڑا نظر آیا۔ جس نے اس کی طرف للچائی نظروں سے دیکھا تھا سلطانہ نے ہاتھ سے اسے اشارہ کیا۔ اس آدمی نے ادھر ادھر دیکھ کر ایک لطیف اشارے سے پوچھا۔ کدھر سے آؤں۔ سلطانہ نے اسے راستہ بتا دیا۔ وہ آدمی تھوڑی دیر کھڑا رہا۔ مگر پھر بڑی پھرتی سے اوپر چلا آیا۔

سلطانہ نے اسے دری پر بٹھایا۔ جب وہ بیٹھ گیا تو اس نے سلسلۂ گفتگو شروع کرنے کے لئے کہا: "آپ اوپر آتے ڈر کیوں رہے تھے"۔ وہ آدمی یہ سن کر مسکرایا۔ "تمہیں کیسے معلوم ہوا؟۔ ڈرنے کی بات ہی کیا تھی؟" اس پر سلطانہ نے کہا: "یہ میں نے اس لئے کہا کہ آپ دیر تک وہیں کھڑے رہے اور پھر کچھ سوچ کر ادھر آئے" وہ یہ سن کر پھر مسکرایا۔ "تمہیں غلط فہمی ہوئی۔ میں تمہارے اوپر والے فلیٹ کی طرف دیکھ رہا تھا۔ وہاں کوئی عورت کھڑی ایک مرد کو ٹھینگا دکھا رہی تھی۔ مجھے یہ منظر پسند آیا۔ پھر بالکنی میں سبز بلب روشن ہوا تو میں کچھ دیر کے لئے ٹھہر گیا۔ سبز روشنی مجھے

پسند ہے۔ آنکھوں کو بہت اچھی لگتی ہے۔" یہ کہہ کر اس نے کمرے کا جائزہ لینا شروع کر دیا۔ پھر وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ سلطانہ نے پوچھا "آپ جا رہے ہیں؟" اس آدمی نے جواب دیا "نہیں میں تمہارے اس مکان کو دیکھنا چاہتا ہوں ــــ چلو مجھے تمام کمرے دکھاؤ۔"

سلطانہ نے اس کو تینوں کمرے ایک ایک کرکے دکھا دیئے۔ اس آدمی نے بالکل خاموشی سے ان کمروں کا معائنہ کیا۔ جب وہ دونوں پھر اسی کمرے میں آگئے جہاں پہلے بیٹھے تھے تو اس آدمی نے کہا "میرا نام شنکر ہے۔"

سلطانہ نے پہلی بار غور سے شنکر کی طرف دیکھا۔ وہ متوسط قد کا معمولی شکل و صورت کا آدمی تھا مگر اس کی آنکھیں غیر معمولی طور پر صاف اور شفاف تھیں کبھی کبھی ان میں ایک عجیب قسم کی چمک بھی پیدا ہوتی تھی۔ گٹھیلا اور کسرتی بدن تھا۔ کنپٹیوں پر اس کے بال سفید ہو رہے تھے۔ خاکستری رنگ کی گرم پتلون پہنے تھا۔ سفید قمیص تھی جس کا کالر گردن پر سے اوپر کو اٹھا ہوا تھا۔

شنکر کچھ اس طرح دری پر بیٹھا تھا کہ معلوم ہوتا تھا شنکر کے بجائے سلطانہ گاہک ہے۔ اس احساس نے سلطانہ کو قدرے پریشان کر دیا۔ چنانچہ اس نے شنکر سے کہا: "فرمایئے۔ ۔ ۔ ۔"

شنکر بیٹھا تھا۔ یہ سن کر لیٹ گیا "میں کیا فرماؤں، کچھ تم ہی فرماؤ۔ بلایا تمہیں نے ہے مجھے" جب سلطانہ کچھ نہ بولی تو وہ اٹھ بیٹھا "میں سمجھا، لو اب مجھ سے سنو جو

کچھ تم نے سمجھا، غلط ہے۔ میں ان لوگوں میں سے نہیں ہوں جو کچھ دے کر جاتے ہیں ڈاکٹروں کی طرح میری بھی فیس ہے۔ مجھے جب بلایا جائے تو فیس دینا ہی پڑتی ہے۔"

سلطانہ یہ سُن کر چکرا گئی مگر اس کے باوجود اسے بے اختیار ہنسی آ گئی۔" آپ کام کیا کرتے ہیں؟"

شنکر نے جواب دیا۔" یہی جو تم لوگ کرتے ہو۔"

"کیا؟"

"تم کیا کرتی ہو؟"

"میں... میں... میں کچھ بھی نہیں کرتی۔"

"میں بھی کچھ نہیں کرتا۔"

سلطانہ نے بھنّا کر کہا۔" یہ تو کوئی بات نہ ہوئی۔ آپ کچھ نہ کچھ تو ضرور کرتے ہوں گے۔"

شنکر نے بڑے اطمینان سے جواب دیا۔" تم بھی کچھ نہ کچھ ضرور کرتی ہو گی۔"

"جھک مارتی ہوں۔"

"میں بھی جھک مارتا ہوں۔"

"تو آؤ دونوں جھک ماریں۔"

"حاضر ہوں مگر جھک مارنے کے دام میں کبھی نہیں دیا کرتا۔"

"ہوش کی دوا کرو۔ یہ لنگر خانہ نہیں۔"

"اور میں بھی والنٹیر نہیں۔"

سلطانہ یہاں رک گئی۔ اس نے پوچھا۔ "یہ والنٹیر کون ہوتے ہیں؟"

شنکر نے جواب دیا۔ "الو کے پٹھے۔"

"میں الو کی پٹھی نہیں۔"

"مگر وہ آدمی خدابخش جو تمہارے ساتھ رہتا ہے ضرور الو کا پٹھا ہے۔"

"کیوں؟"

"اس لئے کہ وہ کئی دنوں سے ایک ایسے خدارسیدہ فقیر کے پاس اپنی قسمت کھلوانے کی خاطر جا رہا ہے جس کی اپنی قسمت زنگ لگے تالے کی طرح بند ہے۔" یہ کہہ کر شنکر ہنسا۔

اس پر سلطانہ نے کہا۔ "تم ہندو ہو۔ اسی لئے ہمارے ان بزرگوں کا مذاق اڑاتے ہو۔"

شنکر مسکرایا۔ "ایسی جگہوں پر ہندو مسلم سوال پیدا نہیں ہوا کرتے۔ بڑے بڑے پنڈت اور مولوی بھی یہاں آئیں تو شریف آدمی بن جائیں۔"

"جانے کیا اوٹ پٹانگ باتیں کرتے ہو۔ بولو رہو گے؟"

"اسی شرط پر جو پہلے بتا چکا ہوں۔"

سلطانہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ "تو جاؤ رستہ پکڑو۔"

شنکر آرام سے اٹھا۔ پتلون کی جیبوں میں اپنے دونوں ہاتھ ٹھونسے اور

جلتے ہوئے کہا: "میں کبھی کبھی اس بازار سے گذرا کرتا ہوں۔جب بھی تمہیں میری ضرورت ہو بلا لینا ۔۔ بہت کام کا آدمی ہوں۔"

شنکر چلا گیا اور سلطانہ کالے لباس کو بھول کر دیر تک اس کے متعلق سوچتی رہی اس آدمی کی باتوں نے اس کے دکھ کو بہت ہلکا کر دیا تھا۔ اگر وہ انبالے میں آیا ہوتا جہاں کہ وہ خوشحال تھی تو اس نے کسی اور ہی رنگ میں اس آدمی کو دیکھا ہوتا اور بہت ممکن ہے کہ اسے دھکّے دے کر باہر نکال دیا ہوتا مگر یہاں چونکہ وہ بہت اداس رہتی تھی۔ اس لئے شنکر کی باتیں اُسے پسند آئیں۔

شام کو جب خدا بخش آیا تو سلطانہ نے اس سے پوچھا۔"تم آج سارا دن کدھر غائب رہے ہو؟"

خدا بخش تھک کر چور چور ہو رہا تھا۔ کہنے لگا: "پرانے قلعہ کے پاس سے آ رہا ہوں۔ وہاں ایک بزرگ کچھ دنوں سے ٹھیرے ہوئے ہیں۔ انہی کے پاس ہر روز جاتا ہوں کہ ہمارے دن پھر جائیں۔۔"

"کچھ انہوں نے تم سے کہا؟"

"نہیں، ابھی وہ مہربان نہیں ہوئے ۔۔ پر سلطانہ، میں جو ان کی خدمت کر رہا ہوں۔ وہ اکارت کبھی نہیں جائے گی۔ اللہ کا فضل شاملِ حال رہا تو ضرور وارے نیارے ہو جائیں گے۔"

سلطانہ کے دماغ میں محرم منانے کا خیال سمایا ہوا تھا۔ خدا بخش سے رونی

آواز میں کہنے لگی: "سارا سارا دن باہر غائب رہتے ہو۔ میں یہاں پنجرے میں قید رہتی ہوں، کہیں جا سکتی ہوں نہ آسکتی ہوں۔ محرم سر پر آگیا ہے، کچھ تم نے اس کی بھی فکر کی کہ مجھے کالے کپڑے چاہئیں۔ گھر میں پھوٹی کوڑی تک نہیں۔ کنگنیاں تھیں سو وہ ایک ایک کر کے بک گئیں۔ اب تم ہی بتاؤ کیا ہوگا؟ — یوں فقیروں کے پیچھے کب تک مارے مارے پھرا کرو گے۔ مجھے تو ایسا دکھائی دیتا ہے کہ یہاں دہلی میں خدا نے بھی ہم سے منہ موڑ لیا ہے۔ میری سنو تو اپنا کام شروع کر دو۔ کچھ تو سہارا ہو ہی جائے گا۔"

خدا بخش دری پر لیٹ گیا اور کہنے لگا: "پر یہ کام شروع کرنے کے لئے بھی تو تھوڑا بہت سرمایہ چاہئے — خدا کے لئے اب ایسی دکھ بھری باتیں نہ کرو۔ مجھ سے اب برداشت نہیں ہو سکتیں۔ میں نے سچ مچ انبالہ چھوڑنے میں سخت غلطی کی پر جو کرتا ہے۔ اللہ ہی کرتا ہے اور ہماری بہتری ہی کے لئے کرتا ہے۔ کیا پتہ ہے، کچھ دیر اور تکلیفیں برداشت کرنے کے بعد ہم ......"

سلطانہ نے بات کاٹ کر کہا: "تم خدا کے لئے کچھ کرو۔ چوری کرو یا ڈاکہ ڈالو پر مجھے ایک شلوار کا کپڑا ضرور لا دو۔ میرے پاس سفید بوسکی کی قمیص پڑی ہے۔ اس کو میں رنگوا لوں گی۔ سفید نینون کا ایک نیا دوپٹہ بھی میرے پاس موجود ہے۔ وہی جو تم نے مجھے دیوالی پر لا کر دیا تھا۔ یہ بھی قمیص کے ساتھ ہی رنگوا لیا جائے گا۔ ایک صرف شلوار کی کسر ہے۔ سو وہ تم کسی نہ کسی طرح پیدا کر دو ... دیکھو تمہیں میری جان کی

قسم کسی نہ کسی طرح ضرور لا دو۔ میری بھتی کھاؤ اگر نہ لاؤ۔"
خدا بخش اٹھ بیٹھا: "اب تم خواہ مخواہ زور دیئے چلی جا رہی ہو۔ میں کہاں سے لاؤں گا۔ افیم کھانے کے لئے تو میرے پاس ایک پیسہ نہیں۔"
"کچھ بھی کرو مگر مجھے ساڑھے چار گز کالی ساٹن لا دو۔"
"دعا کرو کہ آج رات ہی اللہ دو تین آدمی بھیج دے۔"
"لیکن تم کچھ نہیں کرو گے۔ تم اگر چاہو تو ضرور اتنے پیسے پیدا کر سکتے ہو۔ جنگ سے پہلے یہ ساٹن بارہ چودہ آنے گز مل جاتی تھی۔ اب سوا روپے گز کے حساب سے ملتی ہے۔ ساڑھے چار گزوں پر کتنے روپے خرچ ہو جائیں گے؟"
"اب تم کہتی ہو تو میں کوئی حیلہ کروں گا۔" یہ کہہ کر خدا بخش اٹھا: "لو اب ان باتوں کو بھول جاؤ۔ میں ہوٹل سے کھانا لے آؤں۔"
ہوٹل سے کھانا آیا۔ دونوں نے مل کر زہر مار کیا اور سو گئے۔ صبح ہوئی۔ خدا بخش پرانے قلعے والے فقیر کے پاس چلا گیا اور سلطانہ اکیلی رہ گئی۔ کچھ دیر لیٹی رہی۔ کچھ دیر سوئی رہی۔ ادھر ادھر کمروں میں ٹہلتی رہی۔ دوپہر کا کھانا کھانے کے بعد اس نے اپنا سفید نینون کا دوپٹہ اور سفید بوسکی کی قمیص نکالی اور نیچے لانڈری والے کو رنگنے کیلئے دے آئی۔ کپڑے دھونے کے علاوہ وہاں رنگنے کا کام بھی ہوتا تھا۔ یہ کام کرنے کے بعد اس نے واپس آ کر فلموں کی کتابیں پڑھیں جن میں اس کے دیکھے ہوئے فلموں کی کہانی اور گیت چھپے ہوئے تھے۔ یہ کتابیں

پڑھتے پڑھتے وہ سو گئی۔ جب اٹھی تو چار بج چکے تھے۔ کیونکہ دھوپ آنگن میں سے موری کے پاس تک پہنچ چکی تھی۔ نہا دھو کر فارغ ہوئی تو گرم چادر اوڑھ کر بالکنی میں آکھڑی ہوئی۔ تقریباً ایک گھنٹہ سلطانہ بالکنی میں کھڑی رہی۔ اب شام ہوگئی تھی بتیاں روشن ہو رہی تھیں۔ نیچے سڑک میں رونق کے آثار نظر آنے لگے۔ سردی میں تھوڑی سی شدت ہوگئی ۔ مگر سلطانہ کو یہ ناگوار معلوم نہ ہوئی۔ وہ سڑک پر آتے جاتے ٹانگوں اور موٹروں کی طرف ایک عرصہ سے دیکھ رہی تھی۔ دفعتہً اسے شنکر نظر آیا۔ مکان کے نیچے پہنچ کر اس نے گردن اونچی کی اور سلطانہ کی طرف دیکھ کر مسکرا دیا۔ سلطانہ نے غیر ارادی طور پر ہاتھ کا اشارہ کیا اور اسے اوپر بلا لیا۔

جب شنکر اوپر آگیا تو سلطانہ بہت پریشان ہوئی کہ اس سے کیا کہے۔ دراصل اس نے ایسے ہی بلا سوچے سمجھے اسے اشارہ کر دیا تھا۔ شنکر بے حد مطمئن تھا۔ جیسے اس کا اپنا گھر ہے۔ چنانچہ بڑی بے تکلفی سے پہلے روز کی طرح وہ گاؤ تکیہ سر کے نیچے رکھ کر لیٹ گیا۔ جب سلطانہ نے دیر تک اس سے کوئی بات نہ کی تو اس نے کہا "تم مجھے سو دفعہ بلا سکتی ہو اور سو دفعہ ہی کہہ سکتی ہو کہ چلے جاؤ ۔ میں ایسی باتوں پر کبھی ناراض نہیں ہوا کرتا۔"

سلطانہ شش و پنج میں گرفتار ہو گئی۔ کہنے لگی "نہیں بیٹھو، تمہیں جانے کو کون کہتا ہے۔"

شنکر اس پر مسکرا دیا۔ "تو میری شرطیں تمہیں منظور ہیں۔"

"کیسی شرطیں؟" سلطانہ نے ہنس کر کہا۔ "کیا نکاح کر رہے ہو مجھ سے؟"

"نکاح اور شادی کیسی؟ — نہ تم عمر بھر کسی سے نکاح کروگی نہ میں۔ یہ رسمیں ہم لوگوں کے لئے نہیں — چھوڑو ان فضولیات کو۔ کوئی کام کی بات کرو۔"

"بولو کیا بات کروں؟"

"تم عورت ہو — کوئی ایسی بات شروع کرو جس سے دو گھڑی دل بہل جائے۔ اس دنیا میں صرف دوکانداری ہی دوکانداری نہیں، کچھ اور بھی ہے۔"

سلطانہ ذہنی طور پر اب شنکر کو قبول کر چکی تھی۔ کہنے لگی: "صاف صاف کہو تم مجھ سے کیا چاہتے ہو۔"

"جو دوسرے چاہتے ہیں۔" شنکر اٹھ کر بیٹھ گیا۔

"تم میں اور دوسروں میں پھر فرق ہی کیا رہا؟"

"تم میں اور مجھ میں کوئی فرق نہیں۔ اُن میں اور مجھ میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ ایسی بہت سی باتیں ہوتی ہیں جو پوچھنا نہیں چاہئیں خود سمجھنا چاہئیں۔"

سلطانہ نے تھوڑی دیر تک شنکر کی اس بات کو سمجھنے کی کوشش کی۔ پھر کہا: "میں سمجھ گئی۔"

"تو کہو، کیا ارادہ ہے۔"

"تم جیتے، میں ہاری۔ پر میں کہتی ہوں، آج تک کسی نے ایسی بات قبول نہ کی ہوگی"۔

"تم غلط کہتی ہو — اسی محلے میں تمہیں ایسی سادہ لوح عورتیں بھی مل جائیں گی جو کبھی یقین نہیں کریں گی کہ عورت ایسی ذلت قبول کر سکتی ہے۔ جو تم بغیر کسی احساس کے قبول کر تی رہی ہو۔ لیکن اُن کے نہ یقین کرنے کے باوجود تم ہزاروں کی تعداد میں موجود ہو — تمہارا نام سلطانہ۔ ہے نا؟"

"سلطانہ ہی ہے۔"

شنکر اٹھ کھڑا ہوا اور ہنسنے لگا۔ "میرا نام شنکر ہے — یہ نام بھی عجب اوٹ پٹانگ ہوتے ہیں۔ چلو آؤ اندر چلیں۔"

شنکر اور سلطانہ دری والے کمرے میں واپس آئے تو دونوں ہنس رہے تھے۔ نہ جانے کس بات پر، جب شنکر جانے لگا تو سلطانہ نے کہا۔ "شنکر میری ایک بات مانو گے؟"

شنکر نے جواباً کہا۔ "پہلے بات بتاؤ۔"

سلطانہ کچھ جھینپ سی گئی۔ "تم کہو گے کہ میں دام وصول کرنا چاہتی ہوں مگر۔"

"کہو کہو — رک کیوں گئی ہو۔"

سلطانہ نے جرأت سے کام لے کر کہا۔ "بات یہ ہے کہ محرم آ رہا ہے اور میرے پاس اتنے پیسے نہیں کہ میں کالی شلوار بنوا سکوں — یہاں کے سارے دکھڑے تو تم مجھ سے سن ہی چکے ہو۔ قمیص اور دوپٹہ میرے پاس موجود تھا جو میں نے

آج رنگوانے کے لئے دے دیا ہے۔"

شنکر نے یہ سن کر کہا۔ "تم چاہتی ہو کہ میں تمہیں کچھ روپے دے دوں جو تم یہ کالی شلوار بنوا سکو۔"

سلطانہ نے فوراً ہی کہا۔ "نہیں میرا مطلب یہ ہے کہ اگر ہو سکے تو تم مجھے ایک کالی شلوار لا دو۔"

شنکر مسکرایا۔ "میری جیب میں تو اتفاق ہی سے کبھی کچھ ہوتا ہے۔ بہرحال میں کوشش کروں گا۔ محرم کی پہلی تاریخ کو تمہیں یہ شلوار مل جائے گی سے بس اب خوش ہو گئیں۔" سلطانہ کے بندوں کی طرف دیکھ کر پھر اس نے پوچھا۔ "کیا یہ بندے تم مجھے دے سکتی ہو؟"

سلطانہ نے ہنس کر کہا۔ "تم انہیں کیا کرو گے۔ چاندی کے معمولی بُندے ہیں۔ زیادہ سے زیادہ پانچ روپے کے ہوں گے۔"

اس پر شنکر نے کہا۔ "میں نے تم سے بندے مانگے ہیں۔ ان کی قیمت نہیں پوچھی۔ بولو دیتی ہو۔"

"لے لو۔" یہ کہہ کر سلطانہ نے بندے اتار کر شنکر کو دے دیئے۔ اس کے بعد اسے افسوس ہوا مگر شنکر جا چکا تھا۔

سلطانہ کو قطعاً یقین نہیں تھا کہ شنکر اپنا وعدہ پورا کرے گا مگر آٹھ روز کے

کے بعد محرم کی پہلی تاریخ کو صبح نو بجے دروازے پر دستک ہوئی۔ سلطانہ نے دروازہ کھولا تو شنکر کھڑا تھا۔ اخبار میں لپٹی ہوئی چیز اس نے سلطانہ کو دی اور کہا "ساٹن کی کالی شلوار ہے ــ دیکھ لینا شاید لمبی ہو ــ اب میں چلتا ہوں۔"

شنکر شلوار دے کر چلا گیا اور کوئی بات اس نے سلطانہ سے نہ کی۔ اس کی پتلون میں شکنیں پڑی ہوئی تھیں۔ بال بکھرے ہوئے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ابھی ابھی سو کر اٹھا ہے اور سیدھا ادھر ہی چلا آیا ہے۔

سلطانہ نے کاغذ کھولا۔ ساٹن کی کالی شلوار تھی۔ ایسی ہی جیسی کہ وہ مختار کے پاس دیکھ کر آئی تھی۔ سلطانہ بہت خوش ہوئی۔ بُندوں اور اس سودے کا جو افسوس اسے ہوا تھا۔ اس شلوار نے اور شنکر کی وعدہ ایفائی نے دور کر دیا۔

دوپہر کو وہ نیچے لانڈری والے سے اپنی رنگی ہوئی قمیص اور دوپٹہ لے آئی تینوں کالے کپڑے جب اس نے پہن لئے تو دروازے پر دستک ہوئی۔ سلطانہ نے دروازہ کھولا تو مختار اندر داخل ہوئی۔ اس نے سلطانہ کے تینوں کپڑوں کی طرف دیکھا اور کہا "قمیص اور دوپٹہ تو رنگا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ پر یہ شلوار نئی ہے ــ کب بنوائی؟"

سلطانہ نے جواب دیا "آج ہی درزی لایا ہے۔ یہ کہتے ہوئے اس کی نظریں مختار کے کانوں پر پڑیں۔ "یہ بندے تم نے کہاں سے لئے؟"

مختار نے جواب دیا "آج ہی منگوائے ہیں۔"

اس کے بعد دونوں کو تھوڑی دیر خاموش رہنا پڑا۔

سفید جھوٹ

ماہوار رسالہ "ادبِ لطیف" لاہور کے سالنامہ ۱۹۴۲ء میں میرا ایک افسانہ بعنوان "کالی شلوار" شائع ہوا تھا جسے کچھ لوگ فحش سمجھتے ہیں۔ یہ سفید جھوٹ ہے۔

افسانہ نگاری میرا پیشہ ہے۔ میں اس کے تمام آداب سے واقف ہوں۔ اس سے بیشتر اسی موضوع پر میں کئی افسانے لکھ چکا ہوں۔ اُن میں سے کوئی بھی فحش نہیں ہیں آئندہ بھی اس موضوع پر افسانے لکھوں گا جو فحش نہیں ہوں گے۔

قصہ گوئی ہبوطِ آدم سے جاری ہے اور میرا خیال ہے قیامت تک جاری رہے گی اس کی شکلیں بدلتی جائیں گی۔ لیکن انسان اپنے احساسات دوسرے اذہان تک پہنچانے کا سلسلہ جاری رکھے گا۔ بیسواؤں پر اب تک بہت کچھ لکھا جا چکا ہے اور بہت کچھ لکھا جائے گا۔ ہر اس شے کے متعلق لکھا یا کہا جاتا ہے جو سامنے موجود ہو۔ بیسوائیں اب سے نہیں ہزار ہا سال سے ہمارے درمیان موجود ہیں۔ ان کا تذکرہ الہامی کتابوں میں بھی موجود ہے۔ اب چونکہ کسی الہامی کتاب یا کسی پیغمبر کی گنجائش نہیں رہی۔ اس لئے

موجودہ زمانے میں ان کا ذکر آپ آیات میں نہیں بلکہ اُن اخباروں، رسالوں یا کتابوں میں دیکھتے ہیں جنہیں آپ عود اور لوبان جلائے بغیر پڑھ سکتے ہیں اور پڑھنے کے بعد ردی میں بھی اٹھوا سکتے ہیں۔

میں ایک ایسا انسان ہوں جو ایسے رسالوں اور ایسی کتابوں میں لکھتا ہے اور اس لیے لکھتا ہے کہ اسے کچھ کہنا ہوتا ہے۔ میں جو کچھ دیکھتا ہوں جس نظر اور جس زاویے سے دیکھتا ہوں۔ وہی نظر، وہی زاویہ میں دوسروں کے سامنے پیش کر دیتا ہوں۔ اگر تمام لکھنے والے پاگل تھے تو آپ میرا شمار بھی اُن پاگلوں میں کر سکتے ہیں۔ "کالی شلوار" کا پس منظر ایک دیبشیا کا گھر ہے۔ یہ گھر بئے کے گھر کی طرح حیرت انگیز نہیں جس کے متعلق عجیب و غریب باتیں مشہور ہیں۔ دہلی میں ایسی عورتوں کے لیے ایک مقام منتخب کر کے بے شمار گھر بنائے گئے ہیں میری سلطانہ ایسے ہی ایک بنے بنائے گھر میں رہتی تھی۔ اس نے بئے کی طرح یہ گھر خود نہیں بنایا تھا۔ وہ بئے کی طرح رات کو جگنو پکڑ پکڑ کر اپنا گھر روشن نہیں کرتی تھی۔ روشنی پیدا کرنے کے لئے بجلی موجود تھی اور چونکہ یہ بجلی مفت نہیں مل سکتی اور نہ رہنے کے لیے مکان ہی کرائے کے بغیر مل سکتا ہے۔ اس لئے اسے مزدوری کرنا پڑتی تھی۔ وہ اگر بیاہی ہوتی تو اُسے یہ سب چیزیں مفت مل جاتیں لیکن وہ بیاہی نہیں تھی محض ایک عورت تھی . . . اور جب عورت کو بجلی کے پیسے دینے پڑیں۔ گھر کا کرایہ ادا کرنا پڑے اور جس کے پتے خدا بخش سا آدمی پڑ جائے جو فقیروں کے پیچھے مارا مارا پھرے تو ظاہر ہے کہ وہ ایسی عورت نہیں ہو گی جو ہم اپنے گھروں میں دیکھتے ہیں

میری سلطانہ چکلے کی ایک عورت ہے۔ اس کا پیشہ وہی ہے جو چکلے کی عورتوں کا ہوتا ہے۔ چکلے کی عورتوں کو کون نہیں جانتا۔ قریب قریب ہر شہر میں ایک چکلہ موجود ہے بدرو اور موری کو کون نہیں جانتا۔ ہر شہر میں بدروئیں اور موریاں موجود ہیں جو شہر کی گندگی باہر لے جاتی ہیں... ہم اگر اپنے مرمریں غسل خانوں کی باتیں کر سکتے ہیں۔ اگر ہم صابن اور لیونڈر کا ذکر کر سکتے ہیں تو ان موریوں اور بدروؤں کا ذکر کیوں نہیں کر سکتے جو ہمارے بدن کا میل پیتی ہیں۔ اگر ہم مندروں اور مسجدوں کا ذکر کر سکتے ہیں تو ان قحبہ خانوں کا ذکر کیوں نہیں کر سکتے۔ جہاں سے لوٹ کر کئی انسان مندروں اور مسجدوں کا رخ کرتے ہیں اگر ہم افیون، بھنگ، چرس اور شراب کے ٹھیکوں کا ذکر کر سکتے ہیں تو ان کوٹھوں کا ذکر کیوں نہیں کر سکتے۔ جہاں ہر قسم کا نشہ استعمال کیا جاتا ہے؟

بھنگیوں سے چھوت چھات کی جاتی ہے۔ اگر کوئی بھنگی ہمارے گھر سے گندگی کا ٹوکرا اٹھا کر باہر نکلے تو ہم اپنی ناک پر رومال ضرور رکھ لیں گے۔ ہمیں گھن بھی آئے گی مگر ہم بھنگیوں کے وجود سے تو منکر نہیں ہو سکتے۔ اس فضلے سے تو انکار نہیں کر سکتے جو ہر روز ہمارے جسم سے خارج ہوتا ہے۔ قبض، ہیضہ، اسہال وغیرہ دور کرنے کے لئے دوائیں اسی لئے موجود ہیں کہ ہمارے جسم سے فاسد مادے کا اخراج ضروری ہے۔ گندگی کے نکاس کے لئے نت نئے طریقے سوچے جاتے ہیں۔ اس لئے کہ گندگی ہر روز جمع ہوتی جاتی ہے۔ اگر ہمارے جسم میں ایک انقلاب برپا ہو جائے اور اس کے افعال بدل جائیں تو ہم قبض، ہیضہ اور اسہال کی باتیں نہیں کریں گے یا اگر گندگی کے نکاس کے لئے

کوئی مکانکی طریقہ ایجاد ہو جائے تو بھنگیوں کا وجود باقی نہیں رہے گا۔

ہم اگر بھنگیوں کے متعلق بات کریں گے تو یقیناً کوڑے کرکٹ اور گندگی کا ذکر آئے گا

اگر ہم ویشیاؤں کے متعلق بات کریں گے تو یقیناً ان کے پیشے کا ذکر آئے گا۔

ویشیا کے کوٹھے پر ہم نماز یا درود پڑھنے نہیں جاتے۔ وہاں ہم جس غرض سے جاتے ہیں ظاہر ہے۔ وہاں ہم اس لئے جاتے ہیں کہ وہاں ہم جا سکتے ہیں۔ وہاں جا کر ہم اپنی مطلوبہ جنس بے روک ٹوک خرید سکتے ہیں۔ جب وہاں جانے کی ہمیں کھلی اجازت ہے۔ جب ہر عورت اپنی مرضی پر ویشیا بن سکتی ہے اور ایک لائسنس لے کر جسم فروشی شروع کر سکتی ہے۔ جب یہ تجارت قانوناً جائز تسلیم کی جاتی ہے تو اس کے متعلق ہم کیوں بات چیت نہیں کر سکتے؟

اگر ویشیا کا ذکر فحش ہے تو اس کا وجود بھی فحش ہے۔ اگر اس کا ذکر ممنوع ہے۔ تو اس کا پیشہ بھی ممنوع ہونا چاہیئے۔ ویشیا کو مٹایئے۔ اس کا ذکر خود بخود مٹ جائے گا۔

ہم وکیلوں کے متعلق کھلے بندوں باتیں کر سکتے ہیں۔ ہم نائیوں، دھوبیوں، کنجڑوں اور بھٹیاروں کے متعلق بات چیت کر سکتے ہیں۔ ہم چوروں، اچکوں، ٹھگوں اور راہزنوں کے قصے سنا سکتے ہیں۔ ہم جنوں اور پریوں کی داستانیں بیٹھ کے گھڑ سکتے ہیں۔ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ جب آسمان کی طرف شیطان بڑھنے لگتا ہے تو فرشتے تارے توڑ توڑ کر اسے مارتے ہیں۔ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ایک بیل اپنے سینگوں پر ساری دنیا اٹھائے ہوئے ہے ہم داستان امیر حمزہ اور قصہ طوطا مینا تصنیف کر سکتے ہیں۔ ہم لندھور پہلوان کے گرز

کی تعریف کر سکتے ہیں۔ ہم عمرو عیار کی ٹوپی اور زنبیل کی باتیں کر سکتے ہیں۔ ہم ان طوطوں اور میناؤں کے قصے سنا سکتے ہیں جو ہر زبان میں باتیں کرتے تھے۔ ہم جادوگروں کے منتروں اور ان کے توڑ کی باتیں کر سکتے ہیں۔ ہم عملِ ہمزاد اور کیمیاگری کے متعلق جو من میں آئے کہہ سکتے ہیں۔ ہم داڑھیوں، پاجاموں اور سر کے بالوں کی لمبائی پر لڑ جھگڑ سکتے ہیں۔ ہم روغن جوش، پلاؤ اور قورمہ بنانے کی نئی نئی ترکیبیں سوچ سکتے ہیں۔ ہم یہ سوچ سکتے ہیں کہ سبز رنگ کے کپڑے پر کس رنگ اور کس قسم کے بٹن سجیں گے....
ہم وشیا کے متعلق کیوں نہیں سوچ سکتے۔ اس کے پیشے کے بارے میں کیوں غور نہیں کر سکتے۔ ان لوگوں کے متعلق کیوں کچھ نہیں کہہ سکتے۔ جو اس کے پاس جاتے ہیں؟

ہم ایک نوجوان لڑکے اور ایک نوجوان لڑکی کا باہمی رشتہ معاشقہ کرا سکتے ہیں۔ ان کی پہلی ملاقات داتا گنج بخش کے مزار میں کرا سکتے ہیں۔ ایک دلال بڑھیا بیچ میں لا سکتے ہیں۔ جو ان دو بچھڑی روحوں کو بار بار ملاتی رہے۔ ہم آخر میں ان کے عشق کو ناکام بنا سکتے ہیں۔ دونوں کو زہر پلوا سکتے ہیں۔ ان دونوں کے جنازے ایک اس محلے سے اور ایک اس محلے سے نکلوا سکتے ہیں۔ پھر ان دونوں کی قبریں ایک معجزے کے ذریعے سے آپس میں ملوا سکتے ہیں اور اگر ضرورت محسوس ہو تو اوپر سے فرشتوں کے ہاتھوں سے پھولوں کی بارش بھی کرا سکتے ہیں.... ہم ویشیا کی زندگی کیوں بیان نہیں کر سکتے۔ اسے تو فرشتوں اور ان کے پھولوں کی ضرورت نہیں ہوتی۔ وہ اگر مرتی ہے تو دوسرے محلے سے کوئی جنازہ اس کی موت کا ساتھ نہیں دیتا۔ کوئی قبر اس کی

قبر سے ملنے کی خواہش نہیں کرتی۔

ویشیا کا مکان خود ایک جنازہ ہے جو سماج اپنے کندھوں پر اٹھائے ہوئے ہے وہ اسے جب تک کہیں دفن نہیں کرے گا۔ اس کے متعلق باتیں ہوتی ہی رہیں گی۔ یہ لاش، گلی سڑی سہی، بدبودار سہی، متعفن سہی، بھیانک سہی، گھناؤنی سہی لیکن اس کا منہ دیکھنے میں کیا ہرج ہے ـــ کیا یہ ہماری کچھ نہیں لگتی۔ کیا ہم اس کے عزیز اقارب نہیں ہم کبھی کبھی کفن ہٹا کر اس کا منہ دیکھتے رہیں گے اور دوسروں کو دکھاتے رہیں گے۔

میں نے "کالی شلوار" میں ایسی لاش کا منہ دکھایا ہے۔ ملاحظہ ہو:۔

"سڑک کی دوسری طرف مال گودام تھا جو اس کونے سے اس کونے تک پھیلا ہوا تھا۔ داہنے ہاتھ کو لوہے کی چھت کے نیچے بڑی بڑی گانٹھیں پڑی رہتی تھیں اور ہر قسم کے مال اسباب کے ڈھیر لگے رہتے تھے۔ بائیں ہاتھ کو کھلا میدان تھا جس میں بےشمار ریل کی پٹڑیاں بچھی ہوئی تھیں۔ دھوپ میں لوہے کی یہ پٹڑیاں چمکتیں تو سلطانہ اپنے ہاتھوں کی طرف دیکھتی جن پر نیلی نیلی رگیں بالکل ان پٹڑیوں کی طرح ابھری رہتی تھیں۔ اس لمبے اور کھلے میدان میں ہر وقت انجن اور گاڑیاں چلتی رہتی تھیں۔ کبھی ادھر کبھی ادھر۔ ان انجنوں اور گاڑیوں کی چھک چھک پھک پھک سدا گونجتی رہتی تھی صبح سویرے جب وہ اٹھ کر بالکنی میں آتی تو ـــ ایک عجیب سماں اسے نظر آتا۔ دھندلکے میں انجنوں کے منہ سے گاڑھا گاڑھا دھواں نکلتا تھا اور گدلے آسمان کی

جانب موٹے اور بھاری آدمیوں کی طرح اٹھتا دکھائی دیتا تھا۔ بھاپ کے بڑے بڑے بادل بھی ایک شور کے ساتھ اٹھتے تھے اور آنکھ جھپکنے کی دیر میں ہوا کے اندر گھل مل جاتے تھے۔ پھر کبھی کبھی جب وہ گاڑی کے کسی ڈبے کو جسے انجن نے دھکا دے کر چھوڑ دیا ہو اکیلے پٹڑیوں پر چلتا دیکھتی تو اسے اپنا خیال آتا۔ وہ سوچتی کہ اسے بھی کسی نے زندگی کی پٹڑی پر دھکا دے کر چھوڑ دیا ہے اور خود بخود جا رہی ہے۔ دوسرے لوگ کانٹے بدل رہے ہیں اور وہ چلی جا رہی ہے۔ جانے کہاں؟ پھر ایک روز ایسا آئے گا۔ جب اس دھکے کا زور آہستہ آہستہ ختم ہو جائے گا اور وہ کہیں رک جائے گی۔ کسی ایسے مقام پر جو اس کا دیکھا بھالا نہ ہوگا۔"

ذہین پڑھنے والوں کے لئے اس سے اچھے اشارے اور کیا ہو سکتے ہیں۔ سلطانہ کی زندگی کا صحیح نقشہ ان اشاروں اور کنایوں سے میں نے پیش کرنے کی کامیاب سعی کی ہے۔ دہلی کی میونسپلٹی نے دہلی کی ویشیاؤں کے لئے ایک خاص جگہ مقرر کرتے وقت یہ نہ سوچا ہوگا۔ کہ مال گودام اُن کی زندگی کا صحیح نقشہ پیش کرتا ہے لیکن جو صاحبِ نظر ہیں۔ وہ ان مکانوں اور مال گودام کو آمنے سامنے دیکھ کر "کالی شلوار" جیسے کئی افسانے لکھیں گے۔

اسی لاش کا ایک بار میں نے یوں بھی منہ دکھایا تھا۔ میں اپنے مشہور افسانے "ہتک" کا آغاز ان سطور سے کرتا ہوں۔

"وہ دن بھر کی تھکی ماندی وہ ابھی ابھی اپنے بستر پر لیٹی تھی اور لیٹتے ہی سو گئی تھی۔

میونسپل کمیٹی کا داروغہ صفائی جسے وہ سیٹھ کے نام سے پکارتی تھی۔ ابھی ابھی اس کی پڑی پسلیاں جھنجوڑ کر شراب کے نشے میں چور گھر کو واپس گیا تھا۔ وہ رات یہاں ٹھیرتا۔ پر اسے اپنی دھرم پتنی کا بہت خیال تھا جو اس سے بے حد پریم کرتی تھی۔

"وہ روپے جو اس نے اپنی جسمانی مشقت کے بدلے اس داروغہ سے وصول کئے تھے۔ اس کی چست تھوک بھری چولی کے نیچے سے اوپر کو ابھرے ہوئے تھے۔ کبھی کبھی سانس کے اتار چڑھاؤ سے چاندی کے یہ سکے کھنکھنانے لگتے اور ان کی کھنکھناہٹ اس کے دل کی غیر آہنگ دھڑکنوں میں گھل مل جاتی اور ایسا معلوم ہوتا کہ ان سکوں کی چاندی پگھل کر اس کے دل کے خون میں ٹپک رہی ہے۔

"اس کا سینہ اندر سے تپ رہا تھا۔ یہ گرمی کچھ تو اس برانڈی کا باعث تھی جس کا ادھا داروغہ اپنے ساتھ لایا تھا اور کچھ اس "بیوڑا" کا نتیجہ تھی جس کو سوڈا ختم ہونے پر دونوں نے پانی ملا کر پیا تھا۔

"وہ ساگوان کے لمبے چوڑے پلنگ پر اوندھے منہ لیٹی تھی۔ اس کی باہیں جو کاندھوں تک ننگی تھیں، پتنگ کی اس کانپ کی طرح پھیلی ہوئی تھیں جو رات اوس میں بھیگ جانے کے باعث پتلے کاغذ سے جدا ہو جائے۔ داہنے بازو کی بغل میں شکن آلود گوشت ابھرا ہوا تھا جو بار بار مونڈنے کے باعث سیاہی مائل رنگت اختیار کر گیا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ نچی ہوئی مرغی کی کھال کا ایک ٹکڑہ وہاں پر رکھ دیا گیا ہے۔"

یہ سلطانہ کی ایک بہن سوگندھی کی تصویر ہے۔ اس کے پاس خدابخش کے

بجائے ایک خارش زدہ کتا تھا۔ خدا بخش سلطانہ کا دل نہ بہلا سکا۔ مگر یہ خارش زدہ کتا سوگندھی کے بہت کام آیا۔ میں اس افسانے کے آخر میں لکھتا ہوں:۔

"کتا اپنی ٹنڈ منڈ دم ہلاتا سوگندھی کے پاس واپس آیا اور اس کے قدموں کے پاس بیٹھ کر کان پھڑپھڑانے لگا۔ سوگندھی چونکی۔ اس نے اپنے چاروں طرف ایک بھیانک سناٹا دیکھا۔ ایسا سناٹا جو اس نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اسے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ہر شے خالی ہے۔ جیسے مسافروں سے لدی ہوئی ریل گاڑی سب اسٹیشنوں پر مسافر اتار کر اب لوہے کے شیڈ میں بالکل اکیلی کھڑی ہے۔ یہ خلا جو اچانک سوگندھی کے اندر پیدا ہو گیا تھا۔ اسے بہت تکلیف دے رہا تھا۔ اس نے کافی دیر تک اس خلا کو بھرنے کی کوشش کی مگر بے سود۔ وہ ایک ہی وقت میں بے شمار خیالات اپنے دماغ میں ٹھونستی تھی۔ مگر بالکل چھلنی کا سا حساب تھا۔ ادھر وہ دماغ کو پُر کرتی تھی اور ادھر وہ خالی ہو جاتا تھا۔

بہت دیر تک وہ بید کی کرسی پر بیٹھی رہی۔ سوچ بچار کے بعد بھی جب اس کو اپنا دل پرچانے کا کوئی طریقہ نہ ملا تو اس نے اپنے خارش زدہ کتے کو گود میں اٹھایا اور ساگوان کے چوڑے پلنگ پر اسے اپنے پہلو میں لٹا کر سو گئی"۔

کون ہے جو یہ تصویریں دیکھ کر لذت حاصل کرنے کے واسطے ان ویشیاؤں کے کوٹھے پر جائے گا۔ میری سلطانہ اور میری سوگندھی تنہائی میں دیکھنے والی تصویریں نہیں ہیں۔ جن کے اشتہار آئے دن اخباروں میں چھپتے رہتے ہیں؟ وہ کوئی نیا جوڑ دار آسن

پیش نہیں کرتیں۔ وہ امساک کا کوئی خاندانی نسخہ نہیں بتاتیں۔ وہ کوئی لچھے دار آپ بیتی نہیں سناتیں کہ شہوانی جذبات ابھر آئیں۔

میرا زیرِ بحث افسانہ "کالی شلوار" اگر آپ غور سے پڑھیں تو ذیل کی باتیں آپ کے ذہن میں آئیں گی :-

(۱) سلطانہ ایک معمولی ویشیا ہے۔ پہلے انبالے میں پیشہ کراتی تھی۔ بعد میں اپنے دوست خدا بخش کے کہنے پر دہلی چلی آئی۔ یہاں اس کا کاروبار نہ چلا۔

(۲) خدا بخش خدا پر ناجائز بھروسہ کرنے اور فقیروں کی کرامات پر ایمان لانے والا آدمی تھا۔

(۳) سلطانہ کا جب کاروبار نہ چلا تو وہ بہت افسردہ ہوئی۔ اس کی افسردگی میں اور اضافہ ہو گیا۔ جب خدا بخش فقیروں کے پیچھے پیچھے مارا مارا پھرنے لگا۔

(۴) محرم سر پر آ گیا۔ سلطانہ کی دوسری سہیلیوں نے کالے کپڑے بنوا لئے مگر وہ نہ بنوا سکی۔ اس لئے کہ اس کے پاس کچھ نہیں تھا۔

(۵) اس موقعے پر شنکر آتا ہے۔ ایک آوارہ گرد۔ ذہانت، حاضر جوابی اور خوش گفتاری کے علاوہ جس کے پاس کچھ بھی نہیں تھا۔ وہ سلطانہ کے پاس آتا ہے اور اپنی ان خوبیوں کے معاوضے میں اس سے وہ جنس طلب کرتا ہے جسے وہ دام لے کر فروخت کرتی ہے۔ سلطانہ یہ سودا قبول نہیں کرتی۔

(۶) دوسری مرتبہ شنکر خود نہیں آتا بلکہ اُداس سلطانہ اسے خود بلاتی ہے اور اسے اپنے مٹھیے پانی ایسی زندگی میں ایک حادثے کے طور پر قبول کر لیتی ہے۔ اس

مل کر وہ خوش ہوتی ہے مگر یہ احساس اس کا پیچھا نہیں چھوڑتا کہ محرم کے لئے اس کے پاس ایک کالی شلوار کی کمی ہے۔ وہ شنکر سے کہتی ہے "محرم آ رہا ہے میرے پاس اتنے پیسے نہیں کہ میں کالی شلوار بنوا سکوں۔ یہاں کے سارے دکھڑے تو تم مجھ سے سن ہی چکے ہو۔ قمیص اور دوپٹہ میرے پاس موجود تھا۔ جو میں نے آج رنگوانے کے لئے دے دیا ہے"۔

(۷) شنکر محرم کی پہلی تاریخ کو ایک کالی شلوار سلطانہ کے لئے لے آتا ہے۔۔۔ خدا بخش کا خدا اور خدا رسیدہ بزرگوں پر غیر ضروری اعتقاد کام نہیں آتا لیکن شنکر کی ذہانت کام آجاتی ہے۔

یہ افسانہ پڑھ کر دل و دماغ پر کیا اثر ہوتا ہے؟۔ کیا اس کا پلاٹ۔ یا اس کا اندازِ بیان لوگوں کو ویشیاؤں کی طرف کھینچتا ہے؟ میں اس کے جواب میں کہوں گا ہرگز نہیں۔ اس لئے کہ یہ اس مقصد کے لئے نہیں لکھا گیا۔ اگر اس کو پڑھ کر ایسا اثر پیدا نہیں ہوتا تو یہ افسانہ اخلاقیت سے گرا ہوا نہیں ہے۔ اگر یہ اخلاقیت سے گرا ہوا نہیں تو یہ افسانہ ایسا گیت نہیں جسے حظ اٹھانے کی خاطر لوگ گائیں اور بار بار گائیں۔ کوئی گراموفون کمپنی اس کے ریکارڈ نہیں بھرے گی۔ اس لئے کہ اس میں جذبات اُبھارنے والے دادرے اور ٹھمریاں نہیں ہیں۔

"کالی شلوار" جیسے افسانے تفریح کی خاطر نہیں لکھے جاتے۔ ان کو پڑھ کر شہوانی جذبات کی رال نہیں ٹپکنے لگتی۔۔۔ اس کو لکھ کر میں کسی شرمناک فعل کا مرتکب

نہیں ہوا۔ مجھے فخر ہے کہ میں اس کا مصنف ہوں یں شکر کرتا ہوں کہ میں نے کوئی ایسی مثنوی نہیں لکھی۔ جس کے اشعار میں آپ کی خدمت میں نمونے کے طور پر پیش کرتا ہوں:۔

ہاتھا پائی سے ہانپتے جانا — کھلتے جانے میں ڈھانپتے جانا

وہ ترا منہ سے منہ بھڑا دینا — وہ ترا جیب کا لڑا دینا

وہ ترا پیار سے لپٹ جانا — اور دل کھول کے چمٹ جانا

ہولے ہولے پکارنے لگنا — ڈھیلے ہاتھوں سے مارنے لگنا

منہ سے کچھ کچھ پڑے بکے جانا — چھوٹ جانے کے گوں تکے جانا

تھک کے کہنا خدا کے واسطے چھوڑ — نیند آئی ہے اب مجھے نہ جھنجوڑ

وہ ترا ڈھیلے چھوڑنا بے بس — وہ تیرا مست ہو کے کہنا بس

بات باقی نہیں رہی اب تو — رات باقی نہیں رہی اب تو

کہیں تیری یہ بات نبڑے گی — یا یونہی ساری رات نبڑے گی

مجھ میں باقی کچھ اب تو بات نہیں — صبح بھی ہو چکی ہے رات نہیں

دیکھ اب آگے مار بیٹھوں گی — باکسو کو پکار بیٹھوں گی

آدمی کی جو ریخ نکلے گی — منہ سے کیونکر نہ چیخ نکلے گی

کبھی پھر بھی تو کام ہووے گا — دیکھیو کون ساتھ سووے گا

(اقتباسات از مثنوی میر درد مطبوعہ انجمن ترقی اردو)

شکر ہے کہ میں نے اپنی پیاس اور مجبو کی خواہشاتِ نفسانی کو پرچانے کے لئے ایسے اشعار نہیں لکھے۔

لب سے لب مرے ملائے رکھنا — بازو سے وہ سر اٹھائے رکھنا
وہ سینے پہ لیٹ کے ستانا — مطلب کے سخن پہ روٹھ جانا
وہ منہ میں زبان کی لذتیں ہائے — ظاہر حرکت سے رغبتیں ہائے
اپنا جو ہوا کچھ اور ارادہ — جی چاہا کہ اس سے بھی زیادہ
وہ ہاتھ کو رکھ کے جوشِ انکار — واکرنے نہ دینا بندِ شلوار
وہ ہاتھ کو دم بدم جھٹکنا — وہ تکیے پہ سر کو دے ٹپکنا
آہستہ لگانی آہ لاتیں — حیلہ کی وہ کیسی کیسی باتیں
وہ ہاتھ کو زور سے چھڑانا — وہ ہو کے تنگ کاٹ کھانا
وہ نیچے پڑے ہی تلملانا — قابو سے تڑپ کے نکل جانا
وہ چیں بجبیں ہو کے کہنا — کن بیکسیوں سے رو کے کہنا
ہے تم کو یہی شغل دن رات — اچھی نہیں لگتی مجھ کو یہ بات
بھرتا ہی نہیں ہے تیرا جی بس — کرتا ہی نہیں ہے تو کبھی بس

(کلیاتِ مومن — مثنوی دوئم — مطبوعہ نولکشور لکھنؤ)

عورت اور مرد کے جنسی رشتے کے متعلق اگر اس انداز میں کچھ کہا جائے تو میں اسے

معیوب سمجھوں گا۔ اس لئے کہ یہ ہر بالغ آدمی کو معلوم ہے۔ تنہائی میں جب مرد اور عورت ایک بستر پر اس غرض سے لیٹتے ہیں تو اسی قسم کی حیوانی حرکات کرتے ہیں لیکن وہ ایسی خوبصورت نہیں ہوتیں۔ جیساکہ ان اشعار میں ظاہر کی گئی ہیں۔ ان کی حیوانیت کو شاعری کے پردے میں چھپا دیا گیا ہے۔ یہ لکھنے والے کی شرارت ہے۔ جو یقیناً قابلِ گرفت ہے۔

اگر مرد عورت کے اس حیوانی فعل کا فلم بنا کر پردے پر پیش کیا جائے تب مجھے یقین ہے کہ اس کو دیکھ کر تمام سلیم الدماغ آدمی نفرت سے منہ پھیر لیں گے۔ لیکن جو اشعار میں نے اوپر نمونے کے طور پر پیش کئے ہیں۔ وہ اس حیوانی فعل کی ایک غلط تصویر پیش کرتے ہیں۔

ایسی شاعری "دماغی جلق" ہے۔ لکھنے اور پڑھنے والوں دونوں کے لئے۔ میں اسے مضر سمجھتا ہوں۔ میرے افسانے کالی شلوار میں ایسا کوئی عیب نہیں۔ میں نے اس میں کہیں بھی مرد اور عورت کے جنسی ملاپ کو لذیذ انداز میں بیان نہیں کیا۔ بیری سلطانہ سے جو اپنے گاہک گوروں کو اپنی زبان میں گالیاں دیا کرتی تھی اور ان کو الّو کے پٹھے سمجھتی تھی۔ کس قسم کی لذت یا کس قسم کی حظ کی توقع کی جا سکتی ہے۔ وہ ایک دکاندار تھی۔ ٹھیٹ قسم کی دکاندار۔ اگر ہم شراب کی دکان پر شراب کی بوتل لینے جائیں تو یہ توقع نہیں کریں گے کہ وہ عمر خیام بنا بیٹھا ہوگا۔ یا اس کو حافظ کا سارا دیوان ازبر یاد ہوگا۔ شراب کے ٹھیکے دار شراب بیچتے ہیں۔ عمر خیام کی رباعیاں

اد، حافظ شیرازی کے شعر نہیں بیچتے۔

میری سلطانہ عورت بعد میں ہے۔ ویشیا سب سے پہلے ہے۔ کیونکہ انسان کی زندگی میں اس کا پیٹ سب سے زیادہ اہم ہے۔ منٹو اس سے پوچھتا ہے: "تم بھی کچھ نہ کچھ ضرور کرتی ہو گی؟"

سلطانہ جواب دیتی ہے: "جھک مارتی ہوں"۔۔۔ وہ یہ نہیں کہتی کہ میں گندم کا بیوپار کرتی ہوں یا سونے چاندی کی تجارت کرتی ہوں۔ اسے معلوم ہے کہ وہ کیا کرتی ہے۔ اگر کسی ٹائپسٹ سے پوچھا جائے کہ تم کیا کام کرتے ہو تو وہ یہی جواب دے گا: "ٹائپ کرتا ہوں"۔ میری سلطانہ اور ایک ٹائپسٹ کیا فرق ہے؟ ۔۔ غور کیجئے!

افسانہ نگار اور جنسی مسائل

کوئی حقیر سے حقیر چیز ہی کیوں نہ ہو۔ مسائل پیدا کرنے کا باعث ہو سکتی ہے ۔۔
مسہری کے اندر، ایک مچھر گھس آئے تو اس کو باہر نکالنے، مارنے اور آئندہ کے لئے
دوسرے مچھروں کی روک تھام کرنے کے مسائل پیدا ہو جاتے ہیں ۔۔ لیکن دنیا کا
سب سے بڑا مسئلہ یعنی تمام مسئلوں کا باپ اُس وقت پیدا ہوا تھا۔ جب آدم نے بھوک
محسوس کی تھی اور اس سے چھوٹا مگر دلچسپ مسئلہ اس وقت پردۂ ظہور پر آیا تھا۔ جب دنیا
کے اس سب سے پہلے مرد کی دنیا کی سب سے پہلی عورت سے ملاقات ہوئی تھی۔

یہ دونوں مسئلے جیسا کہ آپ جانتے ہیں۔ دو مختلف قسم کی بھوکیں ہیں۔ جن کا آپس میں
بہت گہرا تعلق ہے ۔۔ یہی وجہ ہے کہ ہمیں اس وقت جتنے معاشرتی، مجلسی، سیاسی
اور جنگی مسائل نظر آتے ہیں۔ ان کے عقب میں یہی دو بھوکیں جلوہ گر ہیں۔

موجودہ جنگ کا خونیں پردہ اگر اٹھا دیا جائے تو لاشوں کے انبار کے پیچھے آپ کو
ملک گیری کی بھوک کے سوا اور کچھ نظر نہیں آئے گا۔

بھوک کسی قسم کی بھی ہو بہت خطرناک ہے ۔ آزادی کے بھوکوں کو اگر غلامی کی زنجیریں ہی پیش کی جاتی رہیں تو انقلاب ضرور برپا ہوگا ۔ روٹی کے بھوکے اگر فاقے ہی کھینچتے رہے تو وہ تنگ آکر دوسرے کا نوالہ ضرور چھینیں گے ۔ مرد کی نظروں کو اگر عورت کے دیدار کا بھوکا رکھا گیا تو شاید وہ اپنے ہم جنسوں اور حیوانوں ہی میں اس کا عکس دیکھنے کی کوشش کریں ۔

دنیا میں جتنی لعنتیں ہیں، بھوک ان کی ماں ہے ۔ بھوک گداگری سکھاتی ہے ۔ بھوک جرائم کی ترغیب دیتی ہے ۔ بھوک عصمت فروشی پر مجبور کرتی ہے ۔ بھوک انتہا پسندی کا سبق دیتی ہے ۔ اس کا حملہ بہت شدید، اس کا وار بہت بھرپور اور اس کا زخم بہت گہرا ہوتا ہے ۔ بھوک دیوانے پیدا کرتی ہے ۔ دیوانگی بھوک پیدا نہیں کرتی ۔

دنیا کے کسی کونے کا مصنف ہو، ترقی پسند ہو یا تنزل پسند، بوڑھا ہو یا جوان اس کے پیش نظر دنیا کے تمام بکھرے ہوئے مسائل رہتے ہیں، جن پر کہ وہ ان پر لکھتا رہتا ہے ۔ کبھی کسی کے حق میں کبھی کسی کے خلاف !

آج کا ادیب بنیادی طور پر آج سے پانچ سو سال پہلے کے ادیب سے کوئی زیادہ مختلف نہیں ۔ ہر چیز پہ نئے پرانے کا لیبل وقت لگاتا ہے ۔ انسان نہیں لگاتا ۔ ہم آج نئے ادیب کہلاتے ہیں ۔ آنے والی کل ہمیں پرانا کر کے الماریوں میں بند کر دے گی ۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہم بیکار رہنے ۔ ہم نے مفت میں مغز زدگی کی ۔ گھڑی کی سوئی جب ایک سے گذر کر دو کی طرف رینگتی ہے تو ایک کا ہندسہ بے مصرف

نہیں ہو جاتا ۔۔ پورا سفر طے کر کے سوئی پھر اسی ہندسے کی طرف لوٹتی ہے ۔۔ یہ گھڑی کا اصول ہی ہے اور دنیا کا بھی ۔

آج کے نئے مسائل بھی گذری ہوئی کل کے پرانے مسائل سے بنیادی طور پر مختلف نہیں ۔ جو آج کی برائیاں ہیں ۔ گذری ہوئی کل ہی نے ان کے بیج بوئے تھے

جنسی مسائل جس طرح آج کے نئے ادیبوں کے پیش نظر ہیں ۔ اسی طرح پرانے ادیبوں کے پیش نظر بھی تھے ۔۔ انہوں نے ان پر اپنے رنگ میں لکھا ۔ ہم آج اپنے رنگ میں لکھ رہے ہیں ۔

مجھے معلوم نہیں مجھ سے جنسی مسائل کے متعلق بار بار کیوں پوچھا جاتا ہے ۔ شاید اس لئے کہ لوگ مجھے ترقی پسند کہتے ہیں یا شاید اس لئے میرے چند افسانے جنسی مسائل کے متعلق ہیں ۔ یا پھر اس لئے کہ آج کے نئے ادیبوں کو بعض حضرات "جنس زدہ" قرار دے کر انہیں ادب ، مذہب اور سماج سے یک قلم خارج کر دینا چاہتے ہیں ۔۔ وجہ کچھ بھی ہو ۔ میں اپنا نقطہ نظر بیان کئے دیتا ہوں ۔

روٹی اور پیٹ ، عورت اور مرد ۔۔ یہ دو بہت پرانے رشتے ہیں ۔ ازلی اور ابدی ۔۔ روٹی زیادہ اہم ہے یا پیٹ ؟ ۔۔ عورت زیادہ ضروری ہے کہ مرد ؟ ۔۔ میں اس کے متعلق کچھ نہیں کہہ سکتا ۔ اس لئے کہ میرا پیٹ روٹی مانگتا ہے ۔ لیکن مجھے یہ معلوم نہیں کہ گیہوں بھی میرے پیٹ کے لئے اتنا ہی ترستا ہے جتنا کہ میرا پیٹ !

پھر بھی جب میں سوچتا ہوں کہ زمین نے گیہوں کے خوشوں کو بیکار جنم نہیں دیا

ہوگا تو مجھے خوش فہمی ہوتی ہے کہ میرے پیٹ ہی کے لئے وسیع و عریض کھیتوں میں سنہری بالیاں جھومتی ہیں اور پھر ہو سکتا ہے کہ میرا پیٹ پہلے پیدا ہوا ہو اور گیہوں کی یہ بچیاں کچھ دیر کے بعد۔

کچھ بھی ہو، لیکن یہ بات روزِ روشن کی طرح عیاں ہے کہ دنیا کا ادب صرف ان دو رشتوں ہی سے متعلق ہے ۔۔۔ الہامی کتابیں بھی جن کو آسمانی ادب کہنا چاہیئے۔ روٹی اور پیٹ، عورت اور مرد کے تذکروں سے خالی نہیں۔

مگر سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب یہ مسائل اتنے پرانے ہیں کہ ان کا ذکر الہامی کتابوں میں بھی آچکا ہے تو پھر کیوں آج کے ادیب ان پر خامہ فرسائی کرتے ہیں۔۔ کیوں عورت اور مرد کے تعلقات کو بار بار کریدا جاتا ہے اور بقول شخصے عریانی پھیلائی جاتی ہے ۔۔۔

جواب اس سوال کا یہ ہے کہ اگر ایک ہی بار، جھوٹ نہ بولنے اور چوری نہ کرنے کی تلقین کرنے پر ساری دنیا جھوٹ اور چوری سے پرہیز کرتی تو شاید ایک ہی پیغمبر کافی ہوتا ۔۔ لیکن جیسا آپ جانتے ہیں پیغمبروں کی فہرست خاصی لمبی ہے۔

ہم لکھنے والے پیغمبر نہیں، ہم ایک ہی چیز کو، ایک ہی مسئلے کو مختلف حالات میں مختلف زاویوں سے دیکھتے ہیں اور جو کچھ ہماری سمجھ میں آتا ہے۔ دنیا کے سامنے پیش کر دیتے ہیں اور کبھی مجبور نہیں کرتے کہ وہ اسے قبول ہی کرے۔

ہم قانون ساز نہیں، محتسب بھی نہیں۔ احتساب اور قانون سازی دوسروں کا کام ہے ۔۔ ہم حکومتوں پر نکتہ چینی کرتے ہیں۔ لیکن خود حاکم نہیں بنتے۔ ہم عمارتوں کے

نقشے بناتے ہیں۔ لیکن معمار نہیں۔ ہم مرض بتاتے ہیں لیکن دواخانوں کے منتظم نہیں

ہم جنسیات پر نہیں لکھتے، جو سمجھتے ہیں کہ ہم ایسا کرتے ہیں۔ یہ ان کی غلطی ہے۔ ہم اپنے افسانوں میں خاص عورتوں اور خاص مردوں کے حالات پر روشنی ڈالتے ہیں۔۔ ہمارے کسی افسانے کی ہیروئن سے اگر اس کا مرد صرف اس لئے متنفر ہو جاتا ہے کہ وہ سفید کپڑے پسند کرتی ہے اور سادگی پسند ہے تو دوسری عورتوں کو اسے اصول نہیں سمجھ لینا چاہیئے ۔۔ یہ نفرت کیوں پیدا ہوئی اور کن حالات میں پیدا ہوئی ہے۔۔ اس استفہام کا جواب آپ کو ہمارے افسانے میں ضرور مل جائے گا۔

جو لوگ ہمارے افسانوں میں لذت حاصل کرنے کے طریقے دیکھنا چاہتے ہیں۔ انہیں یقیناً ناامیدی ہوگی ۔۔ ہم داؤ پیچ بتانے والے خلیفے نہیں ۔۔ ہم جب اکھاڑے میں کسی کو گرتا دیکھتے ہیں تو اپنی سمجھ کے مطابق آپ کو سمجھانے کی کوشش کرتے ہیں کہ وہ کیوں گرا تھا؟

ہم رجائی ہیں ۔۔ دنیا کی سیاہیوں میں بھی ہم اجالے کی لکیریں دیکھ لیتے ہیں۔ ہم کسی کو حقارت کی نظر سے نہیں دیکھتے ۔۔ چکلوں میں جب کوئی ٹکھیائی اپنے کوٹھے پر سے کسی راہ گذر پر پان کی پیک تھوکتی ہے تو ہم دوسرے تماشائیوں کی طرح نہ تو کبھی اس رہ گذر پر ہنستے ہیں اور نہ کبھی اس ٹکھیائی کو گالیاں دیتے ہیں۔۔ ہم یہ واقعہ دیکھ کر رک جائیں گے ۔۔ ہماری نگاہیں اس غلیظ پیشہ ور عورت کے نیم عریاں لباس کو چیرتی ہوئی، اس کے سیاہ عصیاں بھرے جسم کے اندر داخل ہو کر اس کے دل تک پہنچ جائیں گی

— اس کو ٹٹولیں گی اور ٹٹولتے ٹٹولتے ہم خود کچھ عرصے کے لئے تصوّر میں وہی کریہہ اور متعفن رنڈی بن جائیں گے — صرف اس لئے کہ ہم اس واقعے کی تصویر ہی نہیں بلکہ اس کے اصل محرک کی وجہ بھی پیش کر سکیں۔

جب کسی اچھے خاندان کی جوان، صحت مند اور خوبصورت لڑکی کسی مریل، بدصورت اور قلاش لڑکے کے ساتھ بھاگ جاتی ہے تو ہم اسے ملعون قرار نہیں دیں گے — دوسرے، اس لڑکی کا ماضی، حال اور مستقبل اخلاق کی پھانسی میں لٹکا دیں گے۔ لیکن ہم وہ چھوٹی سی گرہ کھولنے کی کوشش کریں گے جس نے اس لڑکی کے ادراک کو بے حس کیا۔

انسان ایک دوسرے سے کوئی زیادہ مختلف نہیں جو غلطی ایک مرد کرتا ہے۔ دوسرا بھی کر سکتا ہے۔ جب ایک عورت بازار میں دکان لگا کر اپنا جسم بیچ سکتی ہے تو دنیا کی سب عورتیں ایسا کر سکتی ہیں — لیکن غلط کار انسان نہیں۔ وہ حالات ہیں جن کی کھیتیوں میں انسان اپنی غلطیاں پیدا کرتا ہے اور ان کی فصلیں کاٹتا ہے۔

زیادہ تر جنسی مسائل ہی آج کے نئے لوگوں کی توجہ کا مرکز کیوں بنے ہیں۔ اس کا جواب معلوم کرنا کوئی زیادہ مشکل نہیں — یہ زمانہ عجیب و غریب قسم کے انحطاط کا زمانہ ہے — عورت قریب بھی ہے، دور بھی — کہیں مادر زاد برہنگی نظر آتی ہے۔ کہیں سر سے لے کر پیر تک ستر۔ کہیں عورت مرد کے بھیس میں دکھائی دیتی ہے کہیں مرد عورت کے بھیس میں۔

دنیا ایک بہت بڑی کروٹ لے رہی ہے — ہندوستان بھی جہاں آزادی کا

ننھا منا بچہ غلامی کے دامن سے اپنے آنسو پونچھ رہا ہے۔ مٹی کا نیا گھروندا بنانے کے لئے ضد کر رہا ہے ۔۔۔ مشرقی تہذیب کی چولی کے بند کبھی کھولے جاتے ہیں، کبھی بنا کئے جاتے ہیں۔ مغربی تہذیب کے چہرے کا غازہ کبھی ہٹایا جاتا ہے۔ کبھی لگایا جاتا ہے ۔ ایک افراتفری سی مچی ہے ۔۔۔ نئے کھٹ مٹنے پرانی کھاٹوں کی مونج ادھیڑ رہے ہیں۔ پرانے کھٹ مٹنے چلا رہے ہیں۔ ہلی ہوئی چولوں سے کہیں کھٹمل نکل رہے ہیں کہیں پسو ۔۔۔ کوئی کہتا ہے انہیں زندہ رہنے دو۔ کوئی کہتا ہے، نہیں، فنا کر دو۔ اس دھاندلی میں، اس شورش میں ہم نئے لکھنے والے اپنے قلم سنبھالے کبھی اس مسئلے سے ٹکراتے ہیں، کبھی اس مسئلے سے۔

اگر ہماری تحریروں میں عورت اور مرد کے تعلقات کا ذکر آپ کو زیادہ نظر آئے تو یہ ایک فطری بات ہے ۔۔۔ ملک، ملک سے سیاسی طور پر جدا کئے جا سکتے ہیں ۔۔۔ ایک مذہب دوسرے مذہب سے عقیدوں کی بنا پر علیحدہ کیا جا سکتا ہے۔ دو زمینوں کو ایک قانون ایک دوسرے سے بیگانہ کر سکتا ہے۔ لیکن کوئی سیاست، کوئی عقیدہ کوئی قانون، عورت اور مرد کو ایک دوسرے سے دور نہیں کر سکتا۔

عورت اور مرد میں جو فاصلہ ہے۔ اس کو عبور کرنے کی کوشش ہر زمانے میں ہوتی رہے گی ۔۔۔ عورت اور مرد میں جو ایک لرزتی ہوئی دیوار حائل ہے اسے سنبھالنے اور گرانے کی سعی ہر صدی، ہر قرن میں ہوتی رہے گی ۔۔۔ جو اسے عریانی سمجھتے ہیں۔ انہیں اپنے احساس کے ننگ پر افسوس ہونا چاہیئے ۔۔۔ جو اسے اخلاق کی کسوٹی پر پرکھتے ہیں

انہیں معلوم ہونا چاہیئے کہ اخلاق، زنگ ہے جو سماج کے اُسترے پر بے احتیاطی سے جم گیا ہے۔

جو سمجھتے ہیں کہ نئے ادب نے جنسی مسائل پیدا کئے ہیں، غلطی پر ہیں۔ کیونکہ حقیقت یہ ہے کہ جنسی مسائل نے اس نئے ادب کو پیدا کیا ہے۔ اس نئے ادب کو جس میں آپ کبھی کبھی اپنا ہی عکس دیکھتے ہیں اور جھنجھلا اٹھتے ہیں ۔۔۔ حقیقت خواہ شکر ہی میں لپیٹ کر پیش کی جائے۔ اس کی کڑواہٹ دور نہیں ہو گی۔

ہماری تحریریں آپ کو کڑوی اور کسیلی لگتی ہیں مگر اب تک جو مٹھاسیں آپ کو پیش کی جاتی رہی ہیں۔ ان سے انسانیت کو کیا فائدہ ہوا ہے؟ ۔۔۔ نیم کے پتے کڑوے سہی مگر خون ضرور صاف کرتے ہیں۔

کسوٹی

یہ نئی چیزوں کا زمانہ ہے۔ نئے جوتے، نئی ٹھوکریں، نئے قانون، نئے جرائم، نئی گھڑیاں نئی بے وقتیاں، نئے آقا، نئے غلام۔ اور لطف یہ ہے کہ ان نئے غلاموں کی کھال بھی نئی ہے جو ادھر ادھڑ کر جدت پسند ہو گئی ہے۔ اب ان کے لئے نئے کوڑے اور نئے چابک تیار ہو رہے ہیں۔

ادب بھی نیا ہے جس کے بے شمار نام ہیں۔ کوئی اسے ترقی پسند کہتا ہے۔ کوئی تنزل پسند۔ کوئی فحش کہتا ہے۔ کوئی مزدور پرست۔ اس نئے ادب کو پرکھنے کے لئے نئی کسوٹیاں بھی موجود ہیں ...... یہ کسوٹیاں پرچے ہیں، سالنامے، ماہنامے، ہفتہ وار اور روزنامہ ۔۔ ان پرچوں کے مالک اور ایڈیٹر بھی نئے ہیں۔ کوئی پاکستانی ہے، کوئی اکھنڈ ہندوستانی کوئی کانگرسی ہے کوئی کمیونسٹ ...... سب اپنی اپنی کسوٹی پر اس نئے ادب کو پرکھتے رہتے ہیں اور اس کا کھوٹا کھرا بتاتے رہتے ہیں مگر ادب سونا نہیں جو اس کے گھٹتے بڑھتے بھاؤ بتائے جائیں۔ ادب زیور ہے اور جس طرح خوبصورت زیور خالص سونا نہیں ہوتے

اسی طرح خوبصورت ادب پارے بھی خالص حقیقت نہیں ہوتے۔ ان کو سونے کی طرح پتھروں پر گھسا گھسا کر پرکھنا بہت بڑی بے ذوقی ہے۔

ادب یا تو ادب ہے، ورنہ ایک بہت بڑی بے ادبی ہے۔ زیور یا تو زیور ہے ورنہ ایک بہت ہی بدنما شے ہے۔ ادب اور غیر ادب، زیور اور غیر زیور میں کوئی درمیانی علاقہ نہیں

یہ زمانہ نئے دردوں اور نئی ٹیسوں کا زمانہ ہے۔ ایک نیا دور، پرانے دور کا پیٹ چیر کر پیدا کیا جا رہا ہے۔ پرانا دور موت کے صدمے سے رو رہا ہے۔ نیا دور زندگی کی خوشی سے چلا رہا ہے۔ دونوں کے گلے رُندھے پڑے ہیں۔ دونوں کی آنکھیں نمناک ہیں۔

اس نمی میں اپنے قلم ڈبو کر لکھنے والے لکھ رہے ہیں۔ نیا ادب — زبان وہی ہے صرف لہجہ بدل گیا ہے۔ دراصل اسی بدلے ہوئے لہجے کا نام نیا ادب، ترقی پسند ادب، فحش ادب یا مزدور پرست ادب ہے۔

جب کسی انسان کا لہجہ بدل جاتا ہے۔ جب کوئی انسان ہنستے ہنستے رونے لگتا ہے جب کسی راگ کے مدھم سُر ایکا ایکی اونچے ہو جاتے ہیں جب بچہ بلکنے لگتا ہے تو آلہ مقیاس الصوت یعنی آواز ناپنے والے آلے سے میکانکی طریقہ پر اس تبدیلی کو نہیں جانچتے۔ جو اہل دانش ہیں، جو صاحب ذوق ہیں، ہمیشہ اس کیفیت، اس جذبے، اس محرک کو ٹٹولنے کی کوشش کریں گے۔ جس نے یہ تبدیلی پیدا کی۔

ادب ایک فرد کی اپنی زندگی کی تصویر نہیں۔ جب کوئی ادیب قلم اٹھاتا ہے تو وہ اپنے گھریلو معاملات کا روزنامچہ نہیں لکھتا۔ اپنی ذاتی خوشیوں، رنجشوں، بیماریوں اور

تندرستیوں کا ذکر نہیں کرتا۔ اس کی قلمی تصویروں میں بہت ممکن ہے۔ آنسو اس کی دکھی بہن کے ہوں مسکراہٹیں آپ کی ہوں اور قہقہے ایک خستہ حال مزدور کے۔

اس لئے اپنے آنسوؤں اپنی مسکراہٹوں اور اپنے قہقہوں کی ترازو میں ان تصویروں کو تولنا بہت بڑی غلطی ہے۔ ہر ادب پارہ ایک خاص فضا ایک خاص اثر، ایک خاص مقصد کے لئے پیدا ہوتا ہے۔ اگر اس میں وہ خاص فضا وہ خاص اثر اور وہ خاص مقصد محسوس نہ کیا جائے تو وہ ایک بیجان لاش رہ جائے گی

مگر ادب لاش نہیں جسے ڈاکٹر اور اس کے چند شاگرد میز پر لٹا کر پوسٹ مارٹم شروع کر دیں۔ ادب بیماری نہیں۔ بلکہ بیماری کا ردِعمل ہے۔ دوائی نہیں جس کے استعمال کے لئے اوقات اور مقدار کی پابندی عاید کی جاتی ہے۔ ادب درجۂ حرارت ہے اپنے ملک کا، اپنی قوم کا ۔۔ وہ اس کی صحت اور علالت کی خبر دیتا رہتا ہے۔

پرانی الماری کے کسی خانے سے ہاتھ بڑھا کر کوئی گرد آلود کتاب اٹھایئے بیتے ہوئے زمانے کی نبض آپ کی انگلیوں کے نیچے دھڑکنے لگے گی۔

کتنی صدیاں گذر چکی ہیں کتنی نسلیں ان گذری ہوئی صدیوں کے نیچے دفن ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ لاشوں کا ایک انبار ہے جس کی چوٹی پر ہم کھڑے ہیں اور نیچے ایک انتھاہ سمندر کی طرف دیکھ رہے ہیں۔ آسمان کی طرف نگاہ اٹھاتے ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے ہم اس کے بالکل قریب پہنچ گئے ہیں۔ لیکن آنے والے زمانے کی ایک چھوٹی سی کروٹ ۔۔ ایک اور صدی ہماری لاشوں پر ہماری اولاد کو کھڑا کر دے گی اور وہ سمجھے گی

بم اونچے ہیں لیکن سب سے پہلی صدی کی لاش کہاں ہے؟ کس حالت میں ہے؟ کسی کو کچھ معلوم نہیں۔۔۔ لیکن قصۂ آدم وہی ہے۔ ایک عورت اور ایک مرد۔ دو عورتیں اور ایک مرد یا دو مرد اور ایک عورت۔۔۔ یہ گردان ازل سے جاری ہے اور ابد تک جاری رہے گی۔

انسان کو بھوک پہلے بھی لگتی تھی۔ اب بھی لگتی ہے۔ طاقت کا خواہاں پہلے بھی تھا اب بھی ہے۔ شعر و شراب کا شوقین جیسا پہلے تھا۔ اب ہے۔۔۔ تبدیلی کیا ہوئی ہے؟۔۔۔ کچھ بھی نہیں۔ روٹی عورت اور تخت۔۔۔ روٹی عورت اور تخت اور اگر ان سے اکتا گیا تو خدا۔ ایک ایسی طاقت جو روٹی عورت اور تخت سے کہیں زیادہ ناقابل فہم اور ناقابل رسا ہے۔

انسان عورت سے محبت کرتا ہے تو ہیر رانجھا کی داستان بن جاتی ہے۔ روٹی سے محبت کرتا ہے تو ایپی کیوریس کا فلسفہ پیدا ہو جاتا ہے۔ تخت سے پیار کرتا ہے تو سکندر، چنگیز، تیمور یا ہٹلر بن جاتا ہے اور جب خدا سے لو لگاتا ہے تو مہاتما بدھ کا روپ اختیار کر لیتا ہے۔

دنیا بہت وسیع ہے۔ کوئی چیونٹی مارنا بہت بڑا پاپ سمجھتا ہے۔ کوئی لاکھوں انسان ہلاک کر دیتا ہے اور اپنے اس فعل کو بہادری و شجاعت سے تعبیر کرتا ہے۔ کوئی مذہب کو لعنت سمجھتا ہے کوئی اسی کو سب سے بڑی نعمت۔۔۔ انسان کو کس کسوٹی پر پرکھا جائے یوں تو ہر مذہب کے پاس ایک پیمانہ موجود ہے جس پر انسان کس کر پرکھے جاتے ہیں مگر وہ

کسوٹی

بتیا کہاں ہے؟ ۔ ۔ ۔ ۔ سب قوموں، سب مذہبوں، سب انسانوں کی واحد کسوٹی جس پر آپ مجھے اور میں آپ کو پرکھ سکتا ہوں؟ ۔ ۔ ۔ ۔ وہ دھرم کانٹا کہاں ہے۔ جس کے پلڑوں میں ہندو اور مسلمان، عیسائی اور یہودی، کالے اور گورے تُل سکتے ہیں؟

یہ کسوٹی، یہ دھرم کانٹا جہاں کہیں بھی ہے۔ نیا ہے نہ پرانا۔ ترقی پسند ہے۔ نہ تنزل پسند، عریاں ہے نہ مستور، فحش ہے نہ مطہر۔ ۔ ۔ ۔ انسان اور انسان کے سارے فعل اسی ترازو میں تولے جا سکتے ہیں۔ میرے نزدیک کسی اور ترازو کا تصور کرنا بہت ہی بڑی حماقت ہے۔

ہر انسان دوسرے انسان کے پتھر مارنا چاہتا ہے۔ ہر انسان دوسرے انسان کے افعال پرکھنے کی کوشش کرتا ہے۔ یہ اس کی فطرت ہے جسے کوئی بھی حادثہ تبدیل نہیں کر سکتا۔ میں کہتا ہوں اگر آپ میرے پتھر مارنا ہی چاہتے ہیں تو خدارا ذرا سلیقے سے ماریئے۔ میں اس آدمی سے ہرگز ہرگز اپنا سر پھڑوانے کے لئے تیار نہیں جسے سر پھوڑنے کا سلیقہ ہی نہیں آتا۔ اگر آپ کو یہ سلیقہ نہیں آتا تو سیکھئے۔ ۔ ۔ ۔ دنیا میں رہ کر جہاں آپ نمازیں پڑھنا، روزے رکھنا اور محفلوں میں جانا سیکھتے ہیں۔ وہاں پتھر مارنے کا ڈھنگ بھی آپ کو سیکھنا چاہئے۔

آپ خدا کو خوش کرنے کے لئے سو جتن کرتے ہیں۔ میں آپ کے اس قدر نزدیک ہوں۔ مجھے خوش کرنا بھی آپ کا فرض ہے۔ میں نے آپ سے کچھ زیادہ طلب تو نہیں کیا؟ مجھے بڑے شوق سے گالیاں دیجئے۔ میں گالی کو برا نہیں سمجھتا۔ اس لئے کہ یہ کوئی غیر فطری

چیز نہیں لیکن ذرا سلیقے سے دیجئے۔ نہ آپ کا منہ بدمزہ ہو اور نہ میرے ذوق کو صدمہ پہنچے۔

میرے نزدیک بس یہ سلیقہ ہی ایک کسوٹی ہے۔ انسان کے ہر فعل کے لئے، اس کے گناہ کے لئے، اس کے ثواب کے لئے، اس کی شاعری کے لئے، اس کے افسانوں کے لئے،

مجھے نام نہاد نقادوں سے کوئی دلچسپی نہیں۔ نکتہ چینیاں صرف پتیاں نوچ کر بکھیر سکتی ہیں لیکن انہیں جمع کر کے ایک سالم پھول نہیں بنا سکتیں۔

بہت سے نقاد گذر چکے ہیں لیکن ادب میں سے بے ادبیاں دور نہیں ہوئیں بہت سے پیغمبر آ چکے ہیں لیکن انسان ایک دوسرے سے متحد نہیں ہوئے — یہ ایک بہت بڑا الم ہے۔ لیکن مصیبت یہ ہے کہ یہ الم ہی انسانیت کی قسمت ہے۔ اس کی زندگی اور اس کی موت، اس کی جوانی اور اس کا بڑھاپا — یہ الم ہی سعادت حسن منٹو ہے۔ یہ الم ہی آپ ہیں — یہ الم ہی ساری دنیا ہے۔ جس میں کسوٹیاں زیادہ ہیں اور کسے جانے والے کم — جس میں پتھر کم ہیں اور سر پھوڑنے والے زیادہ!

ایک فیصلہ

فحش نگاری کے متعلق ہر شخص اپنی محدود استطاعت کے مطابق فیصلہ کرتا رہا ہے اور کرتا رہے گا لیکن کسی قانونی عدالت میں جب ایسا مسئلہ پیش ہو تو ظاہر ہے کہ بڑے غور و خوض کے بعد سیاق و سباق کو سامنے رکھ کر فیصلہ کیا جائے گا۔

ذیل کا فیصلہ ایک امریکی جج کا ہے جو مشہور مصنف جیمز جوئس کی یولی سیز کو غیر فحش قرار دیتا ہے اس کا ترجمہ میرے دوست جناب محمد حسن عسکری نے کیا ہے، جس کے لئے میں ان کا ممنون و متشکر ہوں۔

اس کے مطالعہ کے بعد میرے عدالتی بیان کی یقیناً بہت حد تک وضاحت ہو جائے گی۔

عدالت ضلع ریاست ہائے متحدہ

جنوبی ضلع، نیویارک

ریاست ہائے متحدہ امریکہ

رائے　　　　　مدعی

بنام　　　　　د ۱۱۰ - ۵۹

ایک کتاب "یولی سیز"

رینڈم ہاؤس، ان کارپوریٹڈ

مدعا علیہ

ریاست ہائے متحدہ نے ۱۹۳۱ء کے ٹیرف ایکٹ، دفعہ ۳۰۵ء قانون ریاست ہائے متحدہ، شق ۱۹، دفعہ ۵-۱۳۰۵، کے ماتحت جیمز جوئس کی کتاب "یولی سیز" کے خلاف اس بنا پر ضبطی کا مطالبہ پیش کیا ہے کہ اس دفعہ کی رو سے یہ کتاب فحش ہے۔ اور اس لئے ریاست ہائے متحدہ کی حدود میں نہیں لائی جا سکتی، بلکہ قانوناً اسے ضبط کر کے برباد کیا جا سکتا ہے۔ اس مطالبے کے ساتھ ایک اقرار نامہ بھی ہے جس کا ذکر بعد میں ہوگا۔

ضبطی کے حکم کے حق میں اور اس مقدمے کو خارج کر دینے کی تجویز کے خلاف ریاست ہائے متحدہ کی طرف سے سرکاری وکیل سیموئل سی کولمن اور نکولس اٹیلس ہیں۔

مقدمے کو خارج کر دینے کی تجویز کے حق میں اور ضبطی کی تجویز کے خلاف مدعا علیہ

رینڈم ہاؤس کی طرف سے میسرز گرین باؤم وُلف اور ارنسٹ وکیل ہیں جن کی نمائندگی موریس ایل ارنسٹ اور الیگزنڈر لنڈے کرتے ہیں۔

ڈولنگ (جج):۔

مقدمے کو خارج کرنے کی تجویز منظور کی جاتی ہے، اور نتیجتاً ضبطی کا حکم صادر کرنے کی سرکاری تجویز کو رد کیا جاتا ہے۔

لہٰذا یہاں یہ حکم درج کیا جاتا ہے کہ مقدمہ بغیر خرچ کے خارج کر دیا گیا۔

ع[11] اس مقدمے میں اُس اصول کی پیروی کی گئی ہے جو میں نے "ریاستہائے متحدہ بنام ایک کتاب ضبطِ تولید" ف ا ۵ (۲ د) ۵۲۵" والے مقدمے کے ضمن میں پیش کی تھی۔ اس کی تفصیل یوں ہے:۔

"یولی سیز" کی ضبطی کے متعلق مدعیٰ علیہ کا جواب داخل ہو جانے کے بعد ریاستہائے متحدہ کے سرکاری وکیل کے دفتر اور مدعیٰ علیہ کے وکیلوں کے درمیان ایک اقرارنامہ ہوا جس کی شرائط یہ ہیں:۔

(۱) کتاب "یولی سیز" مقدمے کا حصّہ سمجھی جائے اور اُس میں شامل کر لی جائے گویا یہ کتاب پوری کی پوری مقدمے کے ماتحت آتی ہے۔

(۲) فریقین جیوری کے ذریعے مقدمے کے حق سے دست بردار ہوتے ہیں۔

(۳) ہر فریق نے منظور کر لیا کہ وہ اپنے حق میں فیصلہ صادر ہونے کی تجویز پیش کرے گا۔

(۴) یہ تجویزیں پیش ہونے کے بعد عدالت قانونی مسائل اور دوسرے اُمور کے

متعلق فیصلہ کر سکے گی۔ اور انکے متعلق عمومی حیثیت سے اپنی رائے دے سکے گی۔

(۵) ان تجویزوں کے متعلق فیصلہ ہو جانے کے بعد عدالت کا فیصلہ اس طرح درج ہوگا گویا یہ فیصلہ باقاعدہ مقدمے کے بعد ہوا ہو۔

میرے خیال میں ایسی کتابوں کی ضبطی کے مقدموں کے لئے یہ طریق کار بہت مناسب ہے۔ یہ طریق کار خصوصاً موجودہ مقدمے کے لئے بہت ہی کار آمد ہے، کیونکہ "یولی سیز" کی طوالت اور اسے پڑھنے کی دشواری کے پیش نظر جیوری کے فریلیے مقدمہ، اگرنا ممکن نہیں، تو انتہائی غیر تسلی بخش ضرور ہوتا۔

عـ۲ میں نے "یولی سیز" ایک دفعہ تو پوری پڑھی ہے، اور جن حصوں کی حکومت کو خاص طور سے شکایت ہے انہیں کئی دفعہ پڑھا ہے۔ دراصل کئی ہفتوں سے میرا سارا فرصت کا وقت اسی مقدمے کے متعلق غور و خوض کرنے میں صرف ہوا ہے جس کے بارے میں فیصلہ دینے کا فرض میرے اوپر عائد ہوتا ہے۔

"یولی سیز" کوئی ایسی کتاب نہیں ہے۔ جسے آسانی سے پڑھا یا سمجھا جا سکے۔ لیکن اس کے بارے میں بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ اور اس پر ٹھیک طرح غور کرنے کے لئے یہ بہتر ہوگا کہ بہت سی دوسری کتابیں بھی پڑھ لی جائیں جو اس کتاب کے خوشہ چینوں میں ہیں۔ چنانچہ "یولی سیز" کا مطالعہ بڑا مشکل کام ہے۔

عـ۳ بہر حال ادبی دنیا میں "یولی سیز" کی جو شہرت ہے وہ اس بات کی متقاضی تھی کہ میں اس پہ جتنا بھی وقت ضروری ہو صرف کروں تاکہ مجھے اس مقصد کے متعلق پوری پوری تشفی ہو جائے جس کے ماتحت یہ کتاب لکھی گئی ہے۔ کیونکہ جب کسی کتاب پر فحش ہونے کا الزام

لگایا جائے تو پہلے یہ طے کرنا ضروری ہے کہ اس کتاب کے لکھنے کا مقصد، عام محاورے کے مطابق، عریاں نگاری تھا یا نہیں ——— یعنی یہ کتاب عریانی سے ناجائز فائدہ اٹھانے کی غرض سے لکھی گئی ہے یا نہیں۔

اگر ہم اس نتیجے پر پہنچیں کہ یہ کتاب عریاں نگاری کے ماتحت آتی ہے تو بس تحقیقات پوری ہو گئی، اور کتاب کی ضبطی لازمی ہے۔

مگر "یولی سیز" میں غیر معمولی صاف گوئی کے باوجود مجھے کہیں بھی شہوت پرستی کا شائبہ تک نہیں ملتا چنانچہ میری رائے ہے کہ یہ کتاب فحش نگاری کے ماتحت نہیں آتی۔

"یولی سیز" لکھتے ہوئے جوئس نے ایک بالکل نادر قسم کی ادبی صنف میں نہیں، تو کم سے کم ایک نئی صنف میں سنجیدگی کے ساتھ ایک تجربہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس نے نچلے متوسط طبقے کے کچھ لوگ لئے ہیں جو سنہ ۱۹۰۴ء میں شہر ڈبلن میں رہتے ہیں، ایک طرف تو وہ یہ بیان کرتا ہے اس سال شروع جون میں ایک دن اپنے روزمرہ کے کاروبار کے سلسلے میں شہر میں پھرتے ہوئے ان لوگوں نے کیا کیا کام کئے، اور ساتھ ہی یہ بھی بتاتا ہے کہ ان میں سے کسی لوگ اس دوران میں کیا سوچتے رہے۔

میں تو سمجھتا ہوں کہ جوئس نے بڑی کامیابی کے ساتھ یہ دکھانے کی کوشش کی ہے کہ شعور کے پردے پر تاثرات اسی طرح جلدی جلدی بدلتے ہیں جیسے سیر بینی میں مناظر، یہ پردہ اس تختی کی طرح ہے جس پر بیک وقت نیچے اوپر دو تحریریں لکھی ہوں۔ ایک آدمی اپنے چاروں طرف جو حقیقی چیزیں دیکھتا ہے وہ بھی اس پردے پر نظر آتی ہیں، اور ان کے ساتھ ہی ساتھ پچھلے تاثرات کے دھندلے دھندلے خاکے بھی جن میں سے کچھ تو حال

بھی کسے ہوتے ہیں اور کچھ تلازمۂ خیال کی مدد سے لاشعور سے اُبھر آتے ہیں۔ جوئس نے پہلے بھی عمل پیش کیا ہے، اُس نے دکھایا ہے کہ جو کردار وہ پیش کر رہا ہے اُس کے افعال و اعمال اور اس کی زندگی پر ان میں سے ہر تاثر کس طرح اثر انداز ہوتا ہے۔

جوئس جو چیز پیش کرنی چاہتا ہے وہ کچھ اس طرح کی ہے جیسے سینما کی فلم پر دو دفعہ یا ممکن ہو تو کئی دفعہ تصویر کھینچی جائے جس میں اصلی منظر تو صاف ہو، اور پس منظر دکھائی دیتا ہو مگر کچھ دھندلا سا، اور مختلف درجوں میں فوکس سے باہر۔

اس قسم کا اثر مصوری والی ٹکنیک زیادہ اچھی طرح پیدا کر سکتی ہے۔ لیکن جوئس نے یہ اثر لفظوں کے ذریعے پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ میرے خیال میں "یولی سیز" پڑھتے ہوئے آدمی کو جس ابہام اور مشکل پسندی سے سابقہ پڑتا ہے۔ اس کا بہت بڑا سبب یہی ہے۔ اور اس سے کتاب کے ایک اور پہلو پر بھی روشنی پڑتی ہے جس پر میں آگے چل کر غور کروں گا۔ یعنی جوئس کا خلوص اور صحیح صحیح طور پر دکھانے کی ایماندارانہ کوشش کہ اس کے کرداروں کے دماغ کس طرح عمل کرتے ہیں۔

جوئس نے "یولی سیز" میں جو ٹکنیک اختیار کی ہے اگر وہ اس پر عمل کرنے میں پوری پوری ایمانداری نہ برتتا تو نفسیاتی اعتبار سے نتیجہ گمراہ کن اور اس کی انتخاب کردہ ٹکنیک کے بالکل خلاف ہوتا۔ فن کے نقطۂ نظر سے ایسا رویہ ناقابلِ معافی ہوتا۔

چونکہ جوئس نے اپنی ٹکنیک سے پوری وفاداری برتی ہے، اور اس کے جو لازمی نتائج ہوتے ہیں۔ ان پر عمل کرنے سے نہیں گھبرایا ہے، بلکہ ایمانداری سے پوری پوری طرح یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ کردار کن چیزوں کے بارے میں سوچ رہے

ہیں، اسی لئے جوئس پر اتنے حملے ہوئے ہیں، اُس کے مقصد کو اکثر غلط طور سے سمجھا گیا ہے اور اُس کی غلط ترجمانی کی گئی ہے۔ اپنا مقصد حاصل کرنے کی ایماندارانہ اور پُرخلوص کوشش میں اُسے اتفاق سے چند ایسے لفظ استعمال کرتے پڑے ہیں جنہیں عام طور سے فحش سمجھا جاتا ہے، اور اس بنا پر وہ صورتِ حال پیدا ہوئی ہے۔ جس کی وجہ سے لوگ کہتے ہیں کہ اس کے کرداروں کے خیالات میں جنسیات کو بہت ہی زیادہ دخل ہے۔

جن لفظوں پر فحش ہونے کا الزام لگایا جاتا ہے وہ پُرانے سیکسن الفاظ ہیں جن سے تقریباً تمام مرد، بلکہ میں تو کہوں گا، بہت سی عورتیں بھی واقف ہیں۔ جن لوگوں کی جسمانی اور ذہنی زندگی جوئس بیان کرنے کی کوشش کر رہا ہے وہ لوگ میرے خیال میں تو ایسے الفاظ عادتاً اور بالکل فطری طور پر استعمال کرتے ہیں۔ جہاں تک کرداروں کے دماغ میں بار بار جنس کا موضوع اُبھر آنے کا تعلق ہے، یہ بات ہمیشہ یاد رکھنی چاہیئے کہ جوئس کے کردار کیلٹ نسل کے ہیں اور یہ بہار کا زمانہ ہے۔

جوئس جیسی ٹکنیک استعمال کرتا ہے اس سے لطف اُٹھانا یا نہ اُٹھانا تو اپنے مذاق پر منحصر ہے جس کے متعلق بحث یا اختلاف رائے بیکار سی چیز ہے، لیکن اس ٹکنیک کو کسی دوسری ٹکنیک کے معیار سے پرکھنا تو مجھے بالکل مہمل بات معلوم ہوتی ہے۔

لہٰذا میری رائے ہے کہ "یولی سیز" ایک ایماندارانہ اور پُرخلوص کتاب ہے، اور میں سمجھتا ہوں کہ جن عقلی دلائل پر اس کتاب کی بنیاد رکھی گئی ہے انکے سامنے یہ اعتراضات بالکل نہیں ٹھیرتے۔

۵۔ اس کے علاوہ اگر ہم اس پر غور کریں کہ جوئس نے اپنے سامنے جو مقصد رکھا تھا وہ کتنا مشکل تھا، مگر اُسے بہت بڑی حد تک کامیابی حاصل ہوئی ہے، تو پتہ چلتا ہے کہ "یولی سیز"

جوئس کی ہنرمندی کا بڑا حیرت انگیز مظاہرہ ہے، جیسا میں کہہ چکا ہوں "یولی سیز" کوئی آسان کتاب نہیں ہے۔ کبھی تو بہت شاندار ہو جاتی ہے اور کبھی بالکل بے رنگ، کہیں تو آسانی سے سمجھ میں آجاتی ہے کہیں بالکل معلق ہو جاتی ہے۔ اس میں بہت سی ایسی جگہیں ہیں جہاں مجھے گھن آنے لگتی ہے لیکن حالانکہ جیسا میں پہلے کہہ چکا ہوں اس کتاب میں بہت سے ایسے الفاظ ہیں جنہیں عام طور سے گندا سمجھا جاتا ہے، مگر مجھے اس میں کوئی ایسی چیز نہیں ملتی۔ جسے میں فحش برائے فحش سمجھ سکوں۔ جوئس اپنے پڑھنے والوں کے لئے جو تصویر بنانے کی کوشش کر رہا ہے اس میں کتاب کا ہر لفظ ایک لازمی جزو کا حکم رکھتا ہے۔ جیسے پچی کاری میں ذرا ذرا سی تفصیل پورے نقش کو مکمل کرنے میں مدد دیتی ہے۔

جوئس جن لوگوں کا نقشہ کھینچ رہا ہے اُن سے اگر کوئی نہ ملنا چاہے تو یہ اُس کی مرضی ہے۔ ممکن ہے کوئی آدمی اُن سے بالواسطہ بھی تعلق نہ رکھنا چاہے اور اس وجہ سے "یولی سیز" نہ پڑھنا چاہتا ہو، یہ بات سمجھ میں آتی ہے۔ لیکن جب لفظوں کا ایسا حقیقی فنکار، جیسا جوئس بے شک و شبہ ہے، یورپ کے ایک شہر میں رہنے والے نچلے متوسط طبقے کی اصلی تصویر کھینچنا چاہے تو کیا امریکہ کے لوگوں کے لئے یہ تصویر دیکھنا قانوناً ممنوع ہونا چاہئے؟

اس سوال کا جواب دینے کے لئے محض یہ سمجھ لینا کافی نہیں ہے کہ جیسا میں اُوپر کہہ آیا ہوں۔ جوئس نے "یولی سیز" اس مقصد کے ماتحت نہیں لکھی۔ جسے عام طور سے فحش نگاری کہا جاتا ہے۔ یہ کتاب جس مقصد سے لکھی گئی ہے اس سے قطع نظر یہ معلوم کرنے کیلئے کہ فی الجملہ اس کتاب کا اثر کیا ہوتا ہے، مجھے چاہئے کہ اسے ایک اور زیادہ معروضی معیار

سے جانچوں۔

ع۶۔ وہ قانون جس کے ماتحت یہ مقدمہ دائر کیا گیا ہے، جہاں تک اس وقت ہمارا تعلق ہے، صرف غیر ملکوں سے ریاستہائے متحدہ کے اندر کوئی فحش کتاب "لانے" کو مذموم قرار دیتا ہے۔ ۱۹۳۰ء کے ٹیرف ایکٹ کی دفعہ ۳۰۵، شق ۱۹، قانون ریاستہائے متحدہ، دفعہ ۱۳۰۵۔ اس قسم کے معاملات سے متعلق قانونوں میں عام طور سے جو الزامی اسمائے صفت پائے جاتے ہیں وہ اس دفعہ میں کتابوں کے خلاف استعمال نہیں کئے گئے ہیں چنانچہ مجھے یہ طے کرنا ہے کہ اس لفظ کی قانونی تعریف کی حدود میں "یولی سیز" فحش ہے یا نہیں۔

عدالت نے قانون کے اعتبار سے لفظ "فحش" کے جو معنی مقرر کئے ہیں وہ یہ ہیں:۔ جس سے جنسی خواہشات کے حرکت میں آنے یا جنسی اعتبار سے ناپاک اور شہوت انگیز خیالات پیدا ہونے کا امکان ہو۔ ڈنلپ بنام ریاست ہائے متحدہ ۱۶۵ یو ایس ۴۸۶، ۵۰۱، ریاستہائے متحدہ بنام ایک کتاب مسمّٰی بہ "ازدواجی محبت" ۴۸ ف (۲ د) ۸۲۱، ۸۲۴، ریاست ہائے متحدہ بنام ایک کتاب مسمّٰی بہ "ضبط تولید" ۵۱ ف (۲ د) ۵۲۵، ۵۲۸، اور مقابلے کے لئے ڈاقی سارٹ بنام ریاستہائے متحدہ، ۲۷۲ یو ایس ۶۵۵، ۶۵۷، سٹورنگن بنام ریاست ہائے متحدہ ۱۶۱ یو ایس ۴۴۶، ۴۵۰، ریاست ہائے متحدہ بنام ڈینیٹ ۳۹ ف (۲ د) ۵۶۴، ۵۶۰ (ک، ک، ۲ د) پیپل بنام ونیڈ لنگ، ۲۵۸ ن ی، ۴۵۱، ۴۵۳،

ایک خاص کتاب ایسے جذبات اور خیالات پیدا کر سکتی ہے یا نہیں، اس کا فیصلہ عدالت کی رائے کے ذریعے یہ دیکھ کر ہوگا کہ اوسط درجے کی جنسی جبلتیں رکھنے والے آدمی پر اس کا کیا اثر ہوتا ہے ۔۔ ایسے آدمی پر جسے فرانسیسی معمولی قسم کی حسیات رکھنے والا انسان کہتے ہیں اور

جس کی حیثیت قانونِ تفتیش کی اس شاخ میں ایک فرضی عامل کی ہوتی ہے جیسے عدالتِ خفیفہ کے مقدموں میں "سمجھ بوجھ والے آدمی" کی حیثیت ہوتی ہے یا رجسٹری کے قانون میں ایجاد کے مسئلے کے متعلق "فن کے ماہر" کی۔

ایسے فرضی عامل کے استعمال میں خطرہ یہ ہوتا ہے کہ جو آدمی ان چیزوں کے بارے میں فیصلہ کر رہا ہے وہ خواہ کتنا ہی غیر جانب دار کیوں نہ رہنا چاہتا ہو، مگر اس کے اندر یہ فطری رجحان ہوتا ہے کہ اس عامل کو اپنے ذاتی میلانات کا بہت زیادہ پابند بنا دے۔ یہاں میں نے کوشش کی ہے کہ اگر ممکن ہے تو اس خطرے سے بچوں، اور اپنے عامل کو حتی الوسع معروضی بناؤں، اس کے لئے میں نے یہ طریقہ اختیار کیا ہے۔

"یولی سیز" کا جو پہلو زیرِ غور ہے اس کے متعلق اپنا فیصلہ کر چکنے کے بعد میں نے اپنے تاثرات کا مقابلہ دو دوستوں کے تاثرات سے کیا جو میرے خیال میں ایسے معروضی عامل کی مندرجہ بالا شرائط پوری کرتے تھے۔

میں ان ادبی مشیروں سے الگ الگ ملا، اور ان میں سے کسی کو بھی یہ معلوم نہیں تھا کہ میں دوسرے آدمی سے بھی مشورہ لے رہا ہوں۔ یہ دونوں ایسے آدمی ہیں کہ ادب اور زندگی دونوں کے بارے میں میں ان کی رائے کا بڑا احترام کرتا ہوں۔ ان دونوں نے "یولی سیز" پڑھی تھی، اور ان کا مقدمے سے ذرا بھی تعلق نہیں تھا۔

میں نے اپنے مشیروں کو یہ نہیں بتایا کہ میرا فیصلہ کیا ہے۔ میں نے انہیں فحش کی قانونی تعریف بتا دی اور دونوں سے الگ الگ پوچھا کہ اس تعریف کی حدود کے اندر آپ کے خیال میں "یولی سیز" فحش ہے یا نہیں۔

میں نے یہ بات بڑی دلچسپی سے سنی کہ وہ دونوں میری رائے سے متفق تھے: یعنی یہ کہ اگر "یولی سیز" کو مجموعی طور سے پڑھیں، جیسے اس قسم کا فیصلہ کرنے کے لئے ہر کتاب کو پڑھنا چاہیئے تو اس سے جنسی خواہشات یا شہوت انگیز خیالات نہیں بھڑکتے، بلکہ یولی سیز کا آخری اثر ان دونوں پر یہ مرتب ہوا کہ انہیں یہ کتاب مردوں اور عورتوں کی زندگی کی قدرے المناک سی اور بڑی مؤثر تفسیر معلوم ہوئی۔

قانون کا تعلق صرف اوسط درجے کے آدمی سے ہے جو اپنے ہوش و حواس میں ہو چنانچہ "یولی سیز" جیسی کتاب کے سلسلے میں فحش نگاری کی صرف ایک ہی مناسب کسوٹی ہو سکتی ہے، اور یہی وہ ہے جو میں نے بتائی ہے، کیونکہ یہ کتاب انسانیت کے مشاہدے اور بیان کا ایک نیا ادبی اسلوب وضع کرنے کی سنجیدہ اور پرخلوص کوشش ہے۔

مجھے پورا احساس ہے کہ "یولی سیز" کے بعض حصے اتنے تند و تیز ہیں کہ اوسط درجے کے حساس آدمی سے برداشت نہیں ہو سکتے، مگر بہت طویل غور و خوض کے بعد میری رائے یہ ہے کہ گو بہت سی جگہ پڑھنے والے پر "یولی سیز" کا اثر کچھ کراہیت انگیز تو ہوتا ہے، مگر شہوت انگیز کہیں بھی نہیں ہوتا۔

لہٰذا "یولی سیز" ریاستہائے متحدہ کی حدود میں لائی جا سکتی ہے۔

جون، ایم، وولزے

ڈسٹرکٹ جج

۶ دسمبر ۱۹۳۳ء

Hasnain Sialvi

ایک اور فیصلہ

یہ فیصلہ بھی ایک امریکی جج کا ہے جس کا ترجمہ میرے دوست جناب دوست محمد صاحب طاہر نے کیا ہے۔ زیرِ عتاب کتاب ارسکائن کیلڈویل کی تصنیف "گوڈز لیٹل ایکڑ" تھی۔

مشہور امریکی ناول نگار ارسکائن کیلڈویل کے ناول "گوڈز لیٹل ایکڑ" کی اشاعت کے پورے دو سال بعد نیویارک کی "اخلاقی برائیوں کے انسداد کی انجمن" نے وائیکنگ پریس پر اس ناول کو شائع کرنے کے جرم میں مقدمہ چلایا۔

مقدمے کا چلنا تھا کہ تمام امریکی پریس میں شور مچ گیا ملک کے مشہور قلم کاروں نے ملک کے موقر جرائد میں انجمن کے اس اقدام کے خلاف احتجاج کے طور پر مراسلے، مقالے، اور مضامین شائع کرانے شروع کئے۔ عدالت کو جب ان مضامین کی طرف توجہ دلائی گئی تو استغاثہ کے وکیل مسٹر سمنر نے عدالت کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"ہمیں ایسے معاملات سے پہلے بھی سابقہ پڑ چکا ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آیا کسی فوجداری استغاثے کو فیصل کرنے کا حق ایسے جانبدار فریق کو ہے جو پریس میں شور مچا

سکتا ہے اور جس کا مفاد عامۃ الناس کی بہبود سے قطعاً وابستہ نہیں ہے ؛ یا پھر فیصلے کا حق ان عدالتوں کو ہے جو اس مطلب کے لئے بنائی گئی ہیں اور جو محض مصنفوں کے طائفے ہی کی نہیں، بلکہ سب کی برابر نمائندگی کرتی ہیں"۔

مسٹر سمنر نے اسی قبیل کے ایک اور مقدمے کے فیصلے میں فاضل جج کے ان ریمارکس کا حوالہ دیا۔

"فحش نگاری کا معاملہ متوازن دل و دماغ کے آدمیوں کی رائے کے مطابق طے ہونا چاہئے نہ کہ غیر متوازن دل و دماغ رکھنے والے آدمیوں کی رائے کے مطابق۔ اگر ان معاملات میں قانون کو منضبط کرنے کی اجازت غیر معقول آدمیوں کو دیدی گئی تو نتائج بے حد افسوسناک ہوں گے"۔

فاضل جج کے ان الفاظ کی ترجمانی کرتے ہوئے مسٹر سمنر نے عدالت سے کہا۔

"اگر ہم فاضل جج کے الفاظ "غیر متوازن دل و دماغ" کے آدمیوں کی جگہ ایک لفظ یعنی "مصنفین" رکھ دیں تو یقیناً ان تمام مراسلوں، مقالوں اور مضمونوں کی، جو اس کتاب کے مصنف کے حق میں شائع ہوئے ہیں پوری حقیقت کھل جائے گی"۔

مسٹر سمنر کی اس ترجمانی پر نیویارک کی عدالتِ مذکور کے فاضل جج مسٹر بینجمن گرین سپین نے اپنا فیصلہ دیتے ہوئے کہا۔

"مسٹر سمنر نے ملک کے ادبی اور تعلیمی حلقۂ خیال کے رہنماؤں کی معقولیت کے ساتھ فیصلہ کرنے کی صلاحیت پر جو اعتراض کیا ہے عدالت اس کی تائید نہیں کر سکتی۔ عدالت یہ باور کرنے سے انکار کرتی ہے کہ لوگوں کا اتنا بڑا اور نمائندہ گروہ کسی ایسی کتاب کی خواہ مخواہ حمایت پر تُل سکتا ہے۔ جس کی اہمیت اور جس کے ادبی اوصاف پر وہ دل سے یقین نہیں رکھتا۔

"عدالت کی صحیح اور پختہ رائے یہ ہے کہ "غیر معتدل" لوگوں کے اس گروہ میں کسی ادبی تخلیق کی قدروقیمت کے تعین کی صلاحیت ان لوگوں سے کہیں بڑھ کر ہے۔ جو کتاب کو مجموعی حیثیت سے دیکھنے کے بجائے اس میں سے ادھر ادھر کے چند عریاں اقتباس نکالنے ہی کی استطاعت رکھتے ہیں۔

عدالت نے اس کتاب کو بڑے غور سے پڑھنے کے بعد یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ مصنف نے حقیقت پسندانہ طریقے سے اس کتاب میں جنوبی ریاستوں کے ان پڑھ دیہاتی کاشتکار کنبے کی طرز زندگی کی صحیح تصویر کشی کی ہے۔ اس کنبے کی ایک لڑکی جنوب کے صنعتی قصبے کے کسی مزدور سے بیاہی گئی ہے۔ جہاں تھکا دینے اور اکتا دینے والی دیہاتی زندگی اور صنعتی قصبے کی زندگی میں باہمی تفاعل پیدا ہو جاتا ہے۔ گاؤں اور قصبے دونوں جگہ کے لوگ انتہائی مفلسی اور تہذیب کے بالکل ابتدائی مدارج میں اور ترقی کے سامانوں سے یکسر محروم ہیں۔ ان لوگوں کی سرگرمیاں زیادہ تر جنسی قسم کی ہیں۔ ظاہر ہے کہ ایسے سادہ فطرت لوگوں کا پیمانہ جذبہ بہرحال سطح پر ہوتا ہے۔

جس طبقے کی کیفیت اس میں بیان کی گئی ہے۔ گو عدالت اس سے پوری طرح واقف نہیں پھر بھی مصنف کا بیان صحیح معلوم ہوتا ہے۔ عدالت کی اس بات سے یہ نتیجہ نہیں نکالا جا سکتا کہ واقعے کو صحیح طور پر بیان نہیں کیا گیا۔ کتاب میں اس بات کی اندرونی شہادت موجود ہے کہ جنوب کے ایک طبقے کی زندگی کو سچائی اور دیانتداری کے ساتھ دکھانے کی مخلصانہ کوشش کی گئی ہے۔

"مصنف کا مقصد ایک سچی تصویر پیش کرنا تھا۔ ایسی تصویروں میں بعض ضروری

تفصیلوں کا آجانا لابدی امر ہے اور چونکہ ایسی تفصیلوں کا گہرا تعلق زندگی کے جنسی پہلو سے ہوتا ہے اس لئے انہیں بیمانہ صاف گوئی کے ساتھ بیان کر دیا جاتا ہے اس لئے عدالت یہ حکم صادر نہیں کر سکتی کہ ایسی تصویریں سرے سے بنائی ہی نہ جائیں کردار وں کی زبان بلا شبہ بھدی اور گندی ہے مگر عدالت مصنف سے ان پڑھ اور غیر مہذب لوگوں کے منہ میں شائستہ زبان ڈال دینے کا مطالبہ بھی نہیں کر سکتی۔

یہ چیز پوری طرح عیاں ہے کہ کتاب مجموعی حیثیت سے فحش نگاری پر مبنی نہیں ہے۔ یہ بھی عدالت کے لئے ضروری نہیں کہ وہ اس بات کا فیصلہ کرے کہ آیا یہ کتاب ادب کی اہم چیز ہے؟ اس کے نزدیک کتاب کا موضوع ایک ادبی کاوش کے لئے جائز میدان ہے اور موضوع کے ساتھ مصنف کا سلوک بھی بالکل جائز ہے۔ عدالت کے لئے ضروری تھا کہ وہ تمام کتاب پر مجموعی حیثیت سے غور کرتی۔ اگرچہ یہ صحیح ہے کہ بعض پیراگراف اپنی الگ حیثیت سے قابل اعتراض ہیں۔ اس معاملے میں اسی انجمن کے بیک اور تبیل کے مقدمے میں ایک فاضل جج کے ریمارکس کے مطابق ــ کسی کتاب کے چند پیراگرافوں کے اقتباس سے پوری کتاب کا صحیح اندازہ نہیں لگایا جا سکتا۔ ان کی جداگانہ اشاعت قانونی طور پر قابل گرفت ہو سکتی ہے بالکل اسی طرح جیسے ارسٹوفینز، چاسر، بوکیشیو بلکہ کتاب مقدس تک کے بعض مقامات کو قابل تعزیر گردانا جا سکتا ہے۔ تاہم کسی کتاب کو سمجھنے کے لئے اسے مجموعی طور ہی سے دیکھنا چاہئے۔

عدالت کی صائب رائے یہ ہے کہ یہ کتاب ایسی نہیں جس میں برائی اور بدکاری کو خوبی اور نیکوکاری کی حیثیت سے دکھایا ہو یا جس کا منشا معقول آدمیوں کے دل و دماغ میں شہوانی

ہیجان پیدا کرتا ہو۔ لیکن بیمار دل و دماغ والوں پر اس کے اثرات کی پیش بندی عدالت
نہیں کر سکتی۔ اگر عدالت ایسی کتابوں کی اشاعت کو محض اس لئے روک دے کہ وہ
بیمار دل و دماغ والوں میں شہوت پیدا کرنے کا امکان رکھتی ہیں تو پھر ہمارا تمام ادب
سکڑ کر چند غیر دلچسپ اور خشک کتابوں کا چھوٹا سا ذخیرہ بن کر رہ جائے گا۔ کیونکہ اعلیٰ درجے
کے ادب کا بیشتر حصہ یقیناً حذف ہو جائے گا۔

نتیجتہً "گوڈز لٹل ایکر" اپنے پڑھنے والوں کو ہرگز اپنے کرداروں کے مطابق زندگی
گذارنے کی ترغیب نہیں دیتی اور نہ اس کا میلان شہوانی خواہشات کو ابھارنے کی طرف
ہے۔ وہ لوگ جن کی نگاہیں کسی چیز کی خوبیوں کی بجائے برائیوں کو دیکھنے کی طرف لگی
رہتی ہیں ان کی مثال چند درختوں میں الجھ کر پورے جنگل کی وسعت کو نظر انداز کر دینے
والوں کی سی ہے۔

میں ذاتی طور پر یہ محسوس کرتا ہوں کہ ایسی کتابوں کو سختی سے دبا دینے پر پڑھنے
والوں میں خواہ مخواہ تجسس اور استعجاب پیدا ہوتا ہے جو انہیں شہوت پسندی کی ٹوہ
لگانے کی طرف مائل کر دیتا ہے۔ حالانکہ اصل کتاب کا یہ منشاء نہیں ہوتا۔ مجھے پورا
یقین ہے کہ اس کتاب میں مصنف نے صرف وہی چیز منتخب کی ہے جسے وہ امریکی
زندگی کے کسی مخصوص طبقے کے متعلق سچا خیال کرتا ہے۔ میری رائے میں سچائی کو
ادب کے لئے ہمیشہ جائز قرار دینا چاہئے۔

زیر اشاعت

خرابات	عدم	(غزلیں)
نمرود کی خدائی	منٹو	(افسانے)
زیر لب	حفیظ ہوشیار پوری	(غزلیں)
خم کاکل	سیف	(مجموعہ کلام)
میں ساز ڈھونڈتی رہی	ادا جعفری	(,,)
گجر	قتیل شفائی	(,,)
عظمت آدم	ظہیر کاشمیری	(,,)
سر شام	ضیا جالندھری	(,,)
یادیں	سجاد ظہیر	(مضامین)
منٹو کے ڈرامے	منٹو	(ڈرامے)
شادی اور خاندان	طفیل احمد	(سوشل)
ازل سے ابد تک	منیب الرحمن	(نظمیں)
سرائے	احمد راہی	(ناول)
تمثیلچے	جاوید اقبال	(ڈرامے)
منزل کی طرف	انور	(افسانے)
منزل منزل	اے حمید	(افسانے)
۴۸ء کی بہترین نظمیں	ادارہ "سویرا"	(انتخاب)
۴۸ء کا بہترین ادب	,,	(,,)

نیا ادارہ • لاہور

سر کھجاتا ہوں جہاں زخم سر اچھا ہو جائے
لذتِ سنگ باندازۂ تقریر نہیں

یہ ایک چیلنج تھا

لیکن اب

باغی سعادت حسن منٹو

رو دیا ہے

کیا وہ نمرود کی خدائی تھی
بندگی میں میرا بھلا نہ ہؤا!

لذتِ سنگ

کے بعد

نمرود کی خدائی

''کالی شلوار'' - ''دھواں'' - ''بو'' اور ''کھول دو''
کے مصنف سعادت حسن منٹو کے تازہ ترین افسانوں کا
مجموعہ جس میں ایک طویل دیباچہ بھی شامل ہے -

نیا ادارہ ● لاہور

مطبوعہ رتن پریس، لاہور